رُخسانہ صبا
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی

اُردو کی چند طویل نظمیں اور اُن کا سیاسی پس منظر

ABSTRACT

Some long poems of Urdu and their political background
By Rukhsana Saba, Research Scholar, Dept. of Urdu, University of Karachi.

Poem *(nazm)* is a genre of Urdu poetry that appeared quite late on literary horizon. English literature and criticism had an ever-lasting impact on the genre of Urdu poem. Urdu poem became a tool of political expression in the post-1857 era because of the influence of English literature. This article evaluates the political background of some long Urdu poems by some well-known Urdu poets.

طویل نظم زندگی پر نا قدانہ نگاہ ڈالتی ہے اور اپنے عصر کے انفرادی و اجتماعی مسائل کے تعلق سے سوالات اٹھاتی ہے نیز اپنے عہد کے سنجیدہ مسائل کو حکیمانہ بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے زندگی کی تعبیرِ نو اور تشکیلِ نو کی طرف آمادہ کرتی ہے۔ ''گلگامش''، ''انوما الش'' اور ''زمزمہء تخلیق'' (سمیری، آشوری ادب)، ''ٹوٹی کشتی کا ملّاح'' (مصری ادب)، ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' (یونانی ادب)، ''مہا بھارت''، اور ''رامائن'' (سنسکرت ادب)، ''اینیڈ'' (لاطینی ادب)، ''شاہنامہء فردوسی'' اور مثنویِ معنوی'' (فارسی ادب)، ''طربیۂ خداوندی'' (اطالوی ادب)، ''فاؤسٹ'' (جرمن ادب)، ''فیئری کوئین'' اور ''پیراڈائز لاسٹ'' (کلاسیکی انگریزی ادب) اور ''ویسٹ لینڈ''، اور ''کینٹوز'' (جدید انگریزی ادب) سے وابستہ وہ نظمیں ہیں جو الگ الگ زمانی و مکانی حدود میں تخلیق ہونے کے باوجود آفاقی قدروں کی حامل ہیں اور مختلف ادوار میں انسان کی روحانی، اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی فکر کی داستان سناتی ہیں۔ عزیز حامد مدنی نے تو دانتے کی ''طربیۂ خداوندی'' کی اخلاقی بنیاد کو بھی سیاسی قرار دیا ہے(۱)۔

خاص طور پر ''ایلیڈ''، ''مہا بھارت''، ''اینیڈ'' اور ''شاہنامہء فردوسی'' جیسی نظمیں اپنے اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال کو منعکس کرتی ہیں لیکن وہ نظمیں بھی جو براہ راست سیاسی موضوعات سے تعلق نہیں رکھتیں ان پر بھی تخلیق کاروں کی سیاسی بصیرت کے اثرات نظر آتے ہیں مثلاً ناقدین کے خیال میں ''فیئری کوئین'' پر اخلاقیات کے ساتھ ساتھ انگلستان کی قومی سیاست کا اثر بھی ہے اور ''ویسٹ لینڈ'' اور ''کینٹوز'' بھی بظاہر تو روحانی اضطراب، اخلاقی زوال، صنعتی عہد کی

پیچیدگیوں اور سماجی انتشار کی داستان سناتی ہیں لیکن دراصل جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی تہذیبی شکست وریخت کے المیے کو ہی پیش کرتی ہیں گویا کسی بھی عہد کے سیاسی حالات ہی اس عہد کی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی تشکیل مثبت اور منفی بنیادوں پر کرتے ہیں اس لیے شعروادب کا سیاسی افکار سے رشتہ ہر دور میں بہت گہرا رہا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ رشتہ سیاسی نظام پر تنقیدی رویّے کی صورت میں استوار رہا ہے۔

عزیز حامد مدنی کی رائے اس حوالے سے توجہ طلب ہے۔

> ''لوگ اب بھی سوال کرتے ہیں کہ شعروادب کا سیاست سے کیا تعلق ہے اور اس میں کوئی تخلیقی ذہن کیوں کر شرکت کر سکتا ہے۔ اس سوال کا ایک انتہائی مایوسی کے عالم میں جواب دیتے ہوئے تھامس مان نے کہا تھا ہمارے وقتوں میں انسانی تقدیر سیاسی اصطلاحوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔(۲)''

سیاسی فکر کے اثرات بڑے پیمانے پر اُردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں کی فکر کا حصہ بھی رہے ہیں۔ اُردو کی طویل نظموں میں سیاسی فکر کی پہلی جھلک تسلسل کے ساتھ ہمیں جنگِ آزادی سے قبل اور بعد لکھی جانے والی ان نظموں میں نظر آتی ہے جنھوں نے شہر آشوب کی صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ بظاہر یہ نظمیں سماجی حقیقت نگاری کی زندہ مثال ہیں لیکن غور کیا جائے تو یہ ایک مخصوص تاریخی تناظر میں لکھی گئیں مثلاً اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول کی تخت نشینی اور مالی بدانتظامی وغفلت، جہاں دار شاہ کی عیش ونشاط سے رغبت، فرخ سیر اور جہاں دار شاہ کے مابین خانہ جنگی کے دوران شاہی خزانے کی بربادی اور لوٹ مار، فرخ سیر کی سازشیں، اس کا قتل اور سید برادران کا شاہی خزانوں پر قبضہ، محمد شاہی دور میں سلطنت کا بدترین نظم ونسق، مرہٹہ سردار باجی راؤ کی پیش قدمی، محمد شاہ کی بےفکری اور عیش وعشرت کے قصے، نادر شاہ کا حملہ اور ہندوستانی افواج کو شکست، دلی کی بربادی اور قتلِ عام میں نادر شاہی فوج کا کردار، محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کے دور میں صفدر جنگ کی بغاوت اور عوام کے دردناک مسائل میں اضافہ، مرہٹہ افواج کی دلی میں لوٹ مار، عالمگیر ثانی کی کسمپرسی اور بے چارگی، احمد شاہ ابدالی کا دہلی پر حملہ اور قتل وغارت، مرہٹوں اور غلام قادر روہیلہ کے مظالم اور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے ادوار میں انگریزوں کے اختیارات میں اضافہ یہ ہے وہ تاریخی اور سیاسی تناظر جس کے تحت اُردو زبان کی یہ قابلِ قدر صنفِ سخن شہر آشوب نہ صرف وجود میں آئی بلکہ ارتقا پذیر بھی ہوئی۔ اس ضمن میں دیگر کئی مثالوں کے ساتھ قائم چاند پوری کے شہر آشوب کی مثال دی جا سکتی ہے جس میں مخمس کی ہیئت میں پینتیس (۳۵) بند ہیں اور یہ نظم اس دور کی عکاسی کرتی ہے جب شاہ عالم ثانی اور ضابطہ خان کے درمیان ہونے والی جنگ میں ضابطہ خان کی شکست کے بعد مرہٹوں نے قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔

مارے ہے جب سے ضابطہ خاں کی ادھر سپاہ
آسوج کی تکیں ہیں مرہٹے ادھر سے راہ
بستی کے لوٹنے پہ رہیلوں کی ہے نگاہ
اک خلق ہے اسیر عجب مخمصے میں آہ
رہنے کا ہے مقام نہ جانے کو راہ ہے

نعیم احمد لکھتے ہیں:

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہرآشوب اُردو کی وہ کلاسیکی صنفِ سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے عوام و خواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیا ہو۔(۳)''

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے برصغیر میں ایک نئے مگر تاریک دور کی ابتدا ہوئی یوں تو اورنگ زیب کے زمانے سے ہی شورشوں کا آغاز ہوگیا تھا اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے رفتہ رفتہ مختلف علاقوں میں پاؤں جمانے شروع کردیے تھے لیکن جنگِ آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان جس سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی بحران سے گزرے اس نے لوگوں میں ایک پسپائی کا احساس بیدار کردیا تھا۔ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

''اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی (۱۸۵۷ء) تک کا عرصہ ایک حوالے سے تحلیلی عہد (Transit Period) ہی کہلاسکتا ہے کیونکہ اس عرصے میں لوگ آہستہ آہستہ ذہنی شکست کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا ڈراپ سین ۱۸۵۷ء میں ہوا۔(۴)''

انگریزی اقتدار کے استحکام کے بعد مغرب کی جانب سے ثقافتی اور فکری یلغار ہوئی۔مشرقی علوم سے بے اعتنائی کا آغاز ہوا۔جدید علوم کے دروازے کھلے تو اس کے ساتھ ساتھ سرسید تحریک کی بدولت سیاسی اور سماجی سطح پر نئے میلانات شعروادب میں داخل ہوئے جس کے اثرات ہمیں خاص طور پر حالی کی نظموں ''مسدس مدوجزر اسلام'' اور ''شکوہء ہند'' میں نظر آتے ہیں۔''مسدسِ حالی'' کو مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی عروج وزوال کی داستان بھی کہا جاسکتا ہے۔پہلی مرتبہ جب یہ نظم ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی تو اس میں مسدس کی ہیئت میں لکھے گئے دوسو چورانوے (۲۹۴) بند شامل تھے لیکن ۱۸۸۶ء میں حالی نے اس پر نظرِ ثانی کی اور نئے ایڈیشن میں نہ صرف یہ کہ کچھ ترامیم کیں بلکہ ضمیمے کے طور پر مزید ایک سو باسٹھ بند بھی شامل کیے اس طرح چارسو چھپن بند کی یہ نظم مسلمانوں کی شکست کے احساس سے شروع ہوتی ہے،

شکست کی وجوہات کا احاطہ کرتی ہے اور آخر میں دعا پر ختم ہوتی ہے۔اسی طرح ''شکوہء ہند ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی جس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مسلمان جب جنوبی ایشیا آئے تو اپنی عسکری صلاحیت، علم وحکمت اور کردار کی رفعت کی بناء پر ایک باوقار قوم تھے لیکن ہند کی آب و ہوا نے ان کے مجموعی مزاج اور کردار میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ وہ اپنا ملی اختصاص کھو بیٹھے۔ یہ نظم بھی طویل ہے، اس میں تیرہ ترکیب بند ہیں اور ہر بند میں گیارہ اشعار ہیں یعنی ایک سو تینتالیس اشعار۔ بظاہر حالی کی یہ دونوں نظمیں قومی اور تہذیبی زوال کا مرثیہ ہیں لیکن ان کے پسِ پردہ یقینی طور پر سیاسی فکر رہی ہے سیاسی میدان میں مسلمانوں کی پسپائی، معاشی اور سماجی سطح پر پسماندگی اور انگریزوں کی بالادستی کے احساس نے ہی حالی کی فکر کو مہمیز دی لیکن طویل نظم کے حوالے سے باقاعدہ طور پر اگر ہمیں کسی شاعر کے ہاں سیاسی افکار نظر آتے ہیں تو وہ اقبال ہیں۔ اقبال نے بھی کئی طویل نظمیں لکھیں جن میں ''شکوہ جواب شکوہ'' کو موضوع کے اعتبار سے ''مسدس حالی'' کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے، ''شمع و شاعر'' کا موضوع روحانی اسرار و رموز کا عرفان اور اس مادی کائنات میں بکھرے ہوئے حقائق کی دریافت ہے، ''مسجدِ قرطبہ'' مردِ خدا کے جلال و جمال کو آواز دیتی نظر آتی ہے، ''ساقی نامہ'' مثنوی کی کلاسیکی روایت میں لکھی جانے والی نظم ہے جس میں زندگی کے ارتقا کے لیے خودی کو بحرِ بیکراں تسلیم کرتے ہوئے اسے سب سے زیادہ فعال قوت قرار دیا گیا ہے لیکن جزوی طور پر ''ساقی نامہ'' کے دوسرے بند میں عالمی سیاسی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنی قوم کو یہ احساس دلایا ہے کہ ملوکیت کا جال ٹوٹ چکا ہے، سرمایہ دارانہ نظام زوال پذیر ہے، برطانوی استعمار کی جڑیں کمزور ہو چکی ہیں، اقوامِ مشرق خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو ہیں، گراں خواب چینی بیدار ہو کر نئی منزلوں کی طرف گامزن ہیں مگر مسلمان کے دل میں عشقِ الٰہی کی جو آگ روشن تھی وہ بجھ چکی ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

(''کلیاتِ اقبال''، ص ۴۱۵)

''ارمغانِ حجاز'' میں شامل طویل نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' یوں تو اہلِ مشرق اور خصوصاً مسلم قوم کی ذہنی غلامی کا المیہ طنزیہ اسلوب میں پیش کرتی ہے لیکن اس میں بھی مغربی جمہوری نظام اور سرمایہ داری کو تباہی و بربادی کا ذمے دار قرار دیا گیا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

(''کلیاتِ اقبال''، ص ۶۴۹۔۶۵۰)

لیکن سیاسی فکر کے حوالے سے اقبال کی دو طویل نظمیں ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ''بانگِ درا میں علامہ اقبال کی ایک اہم طویل نظم'' خضرِ راہ'' بھی شامل ہے۔ اس نظم کے چھ حصے ہیں۔ شاعر، صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ ومحنت اور دنیائے اسلام، لیکن ان چھ حصوں کو اقبال نے خضر اور شاعر کے کردار کے ذریعے وحدت عطا کی ہے۔ پوری نظم مکالماتی اسلوب میں لکھی گئی ہے اور اس طرح نظم میں ڈرامائی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے جس نے نظم کی قراءت میں دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ '' خضرِ راہ'' ترکیب بند کی ہیئت میں ہے اور اس میں کُل گیارہ بند ہیں۔ اقبال نے ترکیب بند کی روایتی ہیئت میں بھی اپنی جدتِ طبع کے تحت تبدیلیاں کی ہیں۔ اس سے قبل ترکیب بند میں اشعار کی تعداد معیّن اور ہر بند میں مساوی ہوتی تھی لیکن اقبال نے سب سے پہلے ''شمع وشاعر'' (۱۹۱۲ع) میں یہ تجربہ کیا اس کے بعد ہمیں ''بانگِ درا'' میں '' خضرِ راہ'' میں یہ تجربہ بہت واضح طور پر نظر آتا ہے ایک اور بات جو'' خضرِ راہ'' کو انفرادیت عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ''بانگِ درا'' کی پہلی طویل نظم ہے جس کو مختلف حصوں میں مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جبکہ نظم کی موضوعی وحدت بھی برقرار ہے۔

اقبال کے فکری ارتقاء کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ''بانگِ درا'' کی حیثیت زیرِ تعمیر عمارت کی سی ہے جبکہ ''بالِ جبریل'' میں اقبال کی فکر کی پختگی اور ایک مربوط فلسفیانہ نظام کی موجودگی عمارت کی تکمیلیت کی طرف اشارہ کرتی ہے اگرچہ ''بانگِ درا'' میں اقبال کے ابتدائی کلام سے لے کے ۱۹۲۴ع تک کا کلام شامل ہے لیکن نظم'' خضرِ راہ'' کو ''بانگِ درا'' میں وہی اہمیت حاصل ہے جو اقبال کی اُردو شاعری میں ''بالِ جبریل'' کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے نظم ''خضرِ راہ'' کو اُردو شاعری کا ''عہد نامہء جدید'' کہا ہے (۵)۔

''بانگِ درا'' میں اقبال کی فکر کے مختلف عناصر جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر طویل نظموں کے تناظر میں دیکھا جائے تو ''شکوہ جواب شکوہ'' میں حالی کے زیرِ اثر مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ بھی ہے اور اصلاحِ قوم کے باب میں ملی و مذہبی تشخص پر اصرار بھی ہے۔ ''شمع وشاعر'' میں اپنے خلاقانہ جوہر کو پہچاننے اور عشق وجنوں اور عقل وخرد دونوں سے کام لینے کو ہی کامیابی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے جبکہ ''طلوعِ اسلام'' تحریکِ خلافت کے تناظر میں لکھی جانے والی ایک ایسی نظم ہے جس میں اس یقین کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت فاتحِ عالم کی صفات اختیار کر لی جائیں تو خونِ صد ہزار انجم سے سحر ضرور پیدا ہوگی اور مسلمان ایک مرتبہ پھر عروج کو پہنچیں گے لیکن اس کے برخلاف''

خضرِ راہ'' میں باوجود اس کے کہ اس کے آخری حصے کا عنوان ''دنیائے اسلام'' ہے بقیہ تمام حصے نہ صرف یہ کہ فرد کی انفرادی حیثیت اور اُس کی قوتِ فکر و عمل کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ عالمی، سیاسی اور معاشی صورتِ حال کی داستان سناتے ہوئے اجتماعی سطح پر انسانوں کو نئی انقلابی فکر اور ایک نئے اور عادلانہ انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے نئے سیاسی اور سماجی نظام کی طرف بڑھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اس طرح جدید اُردو نظم پہلی مرتبہ بہت واضح طور پر مقامیت کے بجائے آفاقیت اور خصوصیت کے ساتھ عمومیت کی طرف گامزن ہوتی ہے۔

نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات شاعر (میں) ساحلِ دریا پر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔ یہ اضطراب کسی ذاتی المیے کے باعث نہیں بلکہ زندگی اور زمانے کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کے حوالے سے ہے کہ شاعر کی ملاقات خضر سے ہو جاتی ہے اور وہ اسے چشمِ جہاں بینا سمجھ کر اُس سے کچھ سوالات کرتا ہے۔ خضر اُسے صحرا نوردی کو عزمِ سفر اور زندگی کے حرکت و تغیر کی دلیل بتاتے ہوئے زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا کرتے ہیں اور مغرب کے جمہوری نظام کو سازِ کہن قرار دیتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی عیارانہ چالوں سے آگاہ کرتے ہیں نیز جدید انسان کو مشرق و مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ مشرق کی نجات کے لیے دنیائے اسلام کی بیداری اور ربط و ضبطِ ملتِ بیضا کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں۔ بظاہر تو خضر کا کردار وہی روایتی اور مقدس مذہبی کردار ہے لیکن اقبال کا شعور ہی بقول احمد ہمدانی یہاں خضرِ راہ ہے کیونکہ اقبال نے اپنی شخصیت کو طالب علمانہ جستجو میں منہمک اور عجز و انکسار کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صرف اقبال کا شعور ہی یہاں خضرِ راہ نہیں ہے بلکہ انسانی بصیرت کو بھی اقبال نے خضرِ راہ کے طور پر پیش کیا ہے اور تمام انسانوں کو یہ دعوت بھی دی ہے کہ وہ عالمی سیاسی و معاشی نظام کے تار و پود اور اس میں چھپے ہوئے مکر و فریب کی چالوں کو سمجھنے کے لیے اپنی بصیرت کو خضرِ راہ بنائیں۔

نظم میں منظر نگاری درجہء کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ پہلے ہی بند میں رات کا سناٹا اور فطرت کا حسن قاری پر بھرپور تاثر قائم کرتا ہے کیونکہ مجرّد فطرت نگاری کے بجائے احساس کی سطح پر اس کا اظہار کیا گیا ہے اور اس طرح شاعر کے اضطراب اور فطرت کے سکوت میں ایک ایسی ہم آہنگی موجود ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ نظم کے دوسرے حصے ''صحرا نوردی'' میں بھی منظر نگاری کا یہ حسن احساس کی سطح پر نمودار ہو کر وجود کی گہرائیوں میں حرکت، عمل، تغیر اور تموج کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً فضائے دشت میں بانگِ رحیل کا گونجنا، ریت کے ٹیلے پہ آہو کا خرامِ ناز ہونا اور بامِ گردوں سے جبینِ جبریل کا نمایاں ہونا یہ سب استعارے فطرت کے مادی مظاہر سے کہیں زیادہ محسوساتی سطح پر جمالِ فطرت کو آشکار کرتے ہیں۔

استعاروں اور تراکیب کے ضمن میں بھی اس نظم نے اُردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ شب سکوت افزاء، انجمِ کم ضو، پیکِ جہاں پیما، جویائے اَسرارِ ازل، خرقہء دیرینہ، گرمِ ناؤ نوش، تگاپوئے دمادم، بانگِ رحیل، خضرِ بے

برگ وساماں، زنجیرِ کشت ونخیل میراثِ خلیل، خشتِ بنیادِ کلیسا، اور دوسری کئی تراکیب ایسی ہیں جو اس وقت کی پوری اُردو شاعری بشمول اقبال کی نظموں کے پہلی مرتبہ استعمال ہوئی ہیں۔

نظم کے دوسرے بند میں علمِ موسیٰؑ کا حیرت فروش ہونا، ایشیا کے خرقہء دیرینہ کا چاک ہو جانا، اسکندر کا محرومِ آبِ زندگی رہنا، ترکمانِ سخت کوش کا خاک وخوں میں مل جانا اور اولادِ ابراہیم کا نئی آتشِ نمرود سے برسرِ پیکار رہنا جیسی تلمیحات نہ صرف یہ کہ عام قاری کو تاریخی حقائق کی جستجو پر اکساتی ہیں بلکہ موضوع کے وسیع تناظر کی گواہی بھی دیتی ہیں۔

اس نظم کے فکری عناصر اپنی ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ زندگی کے جام کا گردشِ پیہم کی تلاش میں رہنا، اسے امروز وفردا کے پیمانے سے ناپنے کے بجائے وقت کی قید سے آزاد رکھنا، زندگی کا اپنی قوتِ تسخیر سے آشکار ہونا، آزادی میں بحرِ بیکراں بن جانا، مغربی جمہوری نظام کے پردے میں نوائے قیصری کا بلند ہونا، عوام کا ملوکیت کی جادوگری کو آزادی کی نیلم پری سمجھنا، بندہء مزدور کا برگِ حشیش کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کے نشے میں مبتلا ہونا اور سرمایہ ومحنت کی کشمکش وہ موضوعات ہیں جو اس سے قبل اُردو شاعری میں داخل نہیں ہوئے اور اس کی بنیادی وجہ اس عہد کے عالمی سیاسی حالات پر اقبال کی گہری نظر ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(''کلیاتِ اقبال''، ص ۲۶۱)

''خضرِ راہ'' ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اس لیے اس نظم پر اس دور کے ہنگامی واقعات کا اثر ہے مثلاً پہلی جنگِ عظیم، انقلابِ روس، یونانیوں کے ہاتھوں ترکوں کی شکست، ترکوں کے مقابلے میں شریف حسین کا باغیانہ رویہ، وسط ایشیا میں انور پاشا کی ناکامی اور لینن کی کامیابی وغیرہ لیکن اس نظم کے تمام اجزاء اپنے کل سے اس طرح مربوط رہے ہیں کہ شاعر کی نگاہ ہنگامی واقعات کے دور رس نتائج، خصوصی واردات میں عمومیت اور آفاقیت (Topicality) میں (Contemperaneity) یعنی وقتی پہلو میں عصریت دیکھنے میں کامیاب رہی ہے(۶)۔

نظم ''خضرِ راہ'' کی سب سے بڑی خوبی اُس کا خوب صورت آہنگ ہے۔ اس نظم کے لیے بحرِ رمل مقصور ومحذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) کا انتخاب کیا گیا ہے جس کی روانی بے مثل ہے۔ اس نظم کا سب سے مقبول شعر یہ ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

اس شعر کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا تصور بظاہر تو الفاظ اور معنی کے اعتبار سے دریائے نیل سے لے کر کاشغر تک کے خطے کو محیط ہوتا ہے لیکن غور کیا جائے تو مصرعے کا آہنگ بھی زمین کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹتا نظر آتا ہے۔ ''خضرِ راہ'' میں علامہ اقبال نے مفہوم و آہنگ میں مطابقت پیدا کرنے کے ہنر سے بڑا کام لیا ہے(۷)۔

طلوعِ اسلام ترکیب بند کی ہیئت میں ہے جس میں نو بند ہیں اور ہر بند میں آٹھ اشعار ہیں اس طرح نظم میں کل بہتر(۷۲) اشعار ہیں۔ یہ نظم تحریکِ خلافت کے تناظر میں لکھی گئی اس لیے اس کی بنیاد سیاسی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو برصغیر کے مسلمانوں نے ترکی کی مدد کی اور اس کے سپاہیوں کو مالی اور طبی امداد بہم پہنچائی جہاں اس وقت خلافت کا تاج خاندانِ عثمانیہ کے سر پر تھا اور برصغیر کے مسلمان حجاز کی نگہبانی کی وجہ سے خلیفہ کی عزت کرتے تھے۔ یہ بات ہندوستان کے فرنگی حکمرانوں کو ناگوار گزری لیکن انھوں نے یہاں کے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ جنگ میں فتح کے بعد وہ ترکی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن بعد میں وہ اپنے اس وعدے سے مکر گئے اور جنگ کے خاتمے کے بعد انھوں نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا، ترکی کے حصے بخرے کر دیے اور وہاں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کی قیادت میں اس رویے کے خلاف تحریک خلافت کا آغاز کیا جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک جاری رہی اس تحریک میں مسلمانوں کے جوش و جذبے نے اقبال کے دل میں امید کا چراغ روشن کیا اور یہ نظم وجود میں آئی۔ نظم کا آغاز ہی پُرامید لہجے میں ہوتا ہے کیونکہ جس طرح دریا میں اٹھنے والا تلاطم گوہر کی سیرابی کا وسیلہ بنتا ہے اسی طرح مغرب کے طوفان نے مشرق کی مردہ رگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

عروقِ مردہء مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

(''کلیاتِ اقبال''، ص ۲۶۷)

اقبال کی امید اس قدر بلند تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں نے اپنی آرزوؤں اور اپنی جستجو کا سراغ لگا لیا ہے اور اپنے گمشدہ جاہ و جلال کی تلاش میں اب وہ اپنے جوہر کو پہچان کر عمل اور جراءت مندی کی راہ پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

(''کلیاتِ اقبال''، ص ۲۶۸)

اس کے بعد اقبال نے نظم میں مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا ہے جب انھوں نے زورِ حیدر، فقرِ بوذر اور صدقِ سلمانی جیسی صفات سے کام لے کر قیصر و کسریٰ جیسی طاقتوں کو بھی شکست دی تھی آج بھی اگر وہ حرص و ہوس کا راستہ چھوڑ کر یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی راہ اختیار کریں گے تو مسلمان سیاسی استحکام اور عزت و وقار کی منزل پر ضرور پہنچیں گے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت کی طرح ان کا اسلوب بھی جلیل و جمیل ہے زندگی میں جتنا تنوع پایا جاتا ہے جوشؔ کی شاعری بھی اپنے موضوعات، اپنے رنگ و آہنگ اور فنی کمالات کی بنا پر اتنی ہی متنوع ہے اور اپنے وجدان، فکر، تخیل، تعقل اور حکمت و تدبر کے حوالے سے منصبِ بلند پر فائز ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا خیال ہے کہ جوشؔ کی شاعری اعلیٰ ترین روایات کی حامل ہوتے ہوئے بھی نڈر، سرکش اور بے باک ہے اور نئے عہد کی بت شکنی کے تند و تیز جذبے سے کام لیتے ہوئے کمیں گاہ میں چھپ کر حملہ کرنے کے بجائے سامنے آ کر وار کرنے کی قائل ہے اس لیے بعض حضرات کی طبع نازک پر گراں بھی گزر سکتی ہے (۸)۔

جوشؔ کے ہاں طویل نظموں کی کمی نہیں۔ انھوں نے زیادہ طویل نظمیں بھی لکھیں اور درمیانے درجے کی طویل نظمیں بھی ان کے ہاں موجود ہیں ''حرفِ آخر'' تو ان کی بڑی اہم شاہکار نظم ہے جو چند حصوں کے سوا بوجوہ مکمل طور پر شائع نہیں ہو سکی۔ ان کے ہاں مذہبی موضوعات پر بھی کئی طویل نظمیں ہیں مثلاً ''طلوعِ فکر'' (۱۱۰/ بند، مسدس) اور ''آوازہء حق'' (۹۴/ بند، مسدس) اور سماجی موضوعات پر بھی طویل نظمیں موجود ہیں مثلاً ''کسان'' (۵۴/ اشعار) اور ''جنگل کی شاہزادی'' (۶۰/ اشعار) وغیرہ۔ اقتصادی اور سیاسی فکر کی روایت میں ''بھوکا ہندوستان'' (۶۰/ اشعار) اور ''بغاوت'' (۸۱/ اشعار) نمایاں ہیں لیکن اگر سیاسی صورتِ حال کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے نمائندہ نظم ''ماتمِ آزادی'' ہے جو خاصی طویل ہے اور پہلی مرتبہ ان کے مجموعے ''سرود و خروش'' میں شامل ہوئی۔ ''افکار'' کے جوشؔ نمبر میں اس نظم کے چوالیس بند (مسدس) شائع کیے گئے ہیں۔ ''سرودِ خروش'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی اور ''افکار'' کے جوش نمبر میں اس نظم کے خاتمے پر ۱۹۴۷ء درج ہے اور اس کا عنوان ''ماتمِ آزادی'' بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظم فیضؔ کے مصرعے ؎

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

کی توسیع ہے۔ فرق یہ ہے کہ فیضؔ کی نظم پاکستان کے حوالے سے ہے۔ اور جوشؔ کی نظم ''ماتمِ آزادی'' بڑے دکھ بھرے انداز میں فسانہء ہندوستان سناتی ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ اس سرزمین نے کیسے کیسے گل کھلائے لیکن

افسوس کہ اب جب آزادی نصیب ہوئی ہے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ انگریز جنھیں ہم اپنا دشمن سمجھتے تھے وہ تو رخصت ہو گئے لیکن ان کے جاتے ہی وطن کی دوستی کا دم بھرنے والے دشمنی پر اتر آئے اور آزادی کے گلرنگ پیرہن میں سے کفن برآمد ہوا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ، جو مخلص، روشن ضمیر اور بلند فکر کے حامل تھے وہ تو رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ مفاد پرستوں اور ساہوکاروں نے لے لی۔

سکوں کے انجمن میں خریدار آ گئے
سیٹھوں کے خادمانِ وفادار آ گئے
کھدر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے
تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیرِ زمیں گئے

(افکار، جوشؔ نمبر، ص ۴۴۷)

آزادی کے بعد تو امنگوں اور آرزوؤں پر جوبن ہونا چاہیے تھا لیکن وہی افسردہ دلی اور بے دلی مقدر ہے، دولتِ طاغوت نے ذہنوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور آزادیاں بوئے غلامی لیے ہوئے ہیں، اربابِ اقتدار نیا بہروپ بدل کر آ گئے ہیں بظاہر یہ دیسی ہیں لیکن ان کی عادات و اطوار اپنے گورے آقاؤں جیسی ہیں یہی وجہ ہے کہ دلوں سے بغاوت کا دھواں پھر اٹھ رہا ہے اور عالم یہ ہے کہ

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

(افکار، جوشؔ نمبر، ص ۴۵۱)

ترقی پسند ادب کی جب بھی بات کی جائے گی علی سردار جعفری کے نام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ علی سردار جعفری نے کئی طویل نظمیں لکھیں جن میں سے زیادہ تر نظمیں عالمی و مقامی سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہیں لیکن ان کی نظموں پر اشتراکی تحریک کے انتہائی گہرے اثرات ہیں ۱۹۴۹ء میں شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعے ''خون کی لکیر'' میں تین طویل نظمیں ''آخری خط''، ''خواب'' اور ''سیلابِ چین'' ہیں۔ ''آخری خط'' پابند نظم ہے اور مثنوی کی ہیئت میں اکہتر (۷۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک جان دیتے ہوئے سرخ سپاہی کا محاذِ جنگ سے اپنی بیوی کے نام آخری خط ہے اس لیے پوری نظم جذباتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ نظم چونکہ ایک ترقی پسند شاعر کی ہے اس لیے اس میں

روس کے سرخ انقلاب کے حوالے سے شدتِ جذبات کا اظہار بھی ہے اور جنگ کا پُر ہول منظر نامہ بھی۔ دوسری طویل نظم ''خواب'' آزاد ہے اور ایک سو چورانوے مصرعوں پر محیط ہے۔ نظم اس طرح آگے بڑھتی ہے جس طرح کوئی تاریخ کے اوراق اُلٹ رہا ہو یا کسی فلم کے مناظر تیزی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں۔ یونان و روما کے اونچے اونچے محلات میں پروان چڑھتی ہوئی داستانیں، انسان کی انسان کے خلاف معرکہ آرائی، انسانوں کو غلام بنانے کا رُجحان، سمرقند اور بخارا کے ایوانوں میں چنگیز خان اور تیمور لنگ کی عیش پسندی کے قصے، آگ اور خون کا کھیل کھیلنے والے تاتاریوں کے قدموں کا غبار، کلیساؤں کے پادریوں کا منافقانہ کردار اور جبر و تشدد پر یقین رکھنے والے روس کے زار یہ سب تاریخ کی وہ گمشدہ کڑیاں ہیں جن کو ملایا جائے تو یقین آجاتا ہے کہ ہر عہد کے انسان کا ایک ہی خواب رہا ہوگا سماجی مساوات اور انسانی آزادی کے خواب۔ نظم قدیم تاریخی ورثے کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور تاریخ کے ایک اہم موڑ پر آکر کھڑی ہوتی ہے اور وہ ہے انقلابِ روس۔

اور وہ ماسکو کا کرملین ہے
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
آج دلی کی آواز بھی سن رہا ہوں
جس کے سینے پہ ظالم فرنگی کے پٹھو بغل بچوں کی ڈگمگاتی حکومت
کا اک بوجھ رکھا ہوا ہے

(''خون کی لکیر''، ص ۱۵۲)

نظم میں غلامی سے نجات، جمہور کی فتح اور آزادی کی نوید سناتے ہوئے جو اسلوب اور جو لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ بھرپور سرشاری کا لہجہ ہے۔ سرشاری کی اس کیفیت کی وجہ سے نظم کے آخری حصے میں نغمگی اور موسیقیت پیدا ہوگئی ہے جس سے نظم کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

بچے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں میں بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں

(''خون کی لکیر''، ص ۱۵۹)

''سیلابِ چین'' بھی آزاد نظم کی ہیئت میں دوسو بیس (۲۲۰) مصرعوں پر محیط ہے لیکن اس میں بلند آہنگی اور نعرہ بازی زیادہ اور شعریت کم ہے البتہ ''ایشیا جاگ اٹھا'' سیاسی فکری روایت میں ایک مشہور اور اہم نظم ہے اور کافی طویل ہے۔ایک طرف تو یہ نظم اہلِ ایشیا کی معاشی بدحالی، بھوک اور غربت کا اشاریہ ہے اور دوسری جانب آنے والے خوش آئند مستقبل کا خواب ۔اس نظم کا ایک حصہ تو اپنی خوب صورت پیکر تراشی اور استعاراتی اسلوب، آہنگ کی روانی، لہجے کی غنائیت اور فطرت کی تصویر کشی کے حوالے سے بلاشبہ بے مثال ہے۔

دلہن بنی وادیوں کی نازک کمر میں جھرنوں کے نرم حلقے
پہاڑیوں کی ہتھیلیوں پر دھرے ہوئے نیلگوں کٹورے
ستارے منہ دیکھتے ہیں جھیلوں کے آئینے میں
ہمالیہ کے گلے میں گنگا کی اور جمنا کی شوخ بانہیں

(''افکار''، علی سردار جعفری نمبر، ص ۳۵۱)

لیکن اتنی خوب صورت وادیوں سے گزرتے ہوئے جب نظم سرمایہ دارانہ نظام کے کوڑھ زدہ جسم کی تصویر کھینچتی ہے تو کراہیت محسوس ہوتی ہے۔نظم کے اس حصے کے ایک ایک مصرعے سے سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کا اظہار ملتا ہے لیکن لہجہ طنزیہ ہے۔

کہیں پہ محرابِ فتح باندھی
کہیں رعونت کی لاٹ اٹھائی
کہیں پہ کانسے کے گھوڑے ڈھالے
کہیں پہ پتھر کے بت بنائے
کہاں ہو ''تہذیب اور تمدن'' کی روشنی لے کے آنے والو!
تمھاری تہذیب کی نمائش ہے ایشیا میں
نظر اٹھاؤ، قریب آؤ
یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو

(''افکار''، علی سردار جعفری نمبر، ص ۳۵۲)

طویل نظموں کے ضمن میں علی سردار جعفری کی سب سے اہم نظم ''نئی دنیا کو سلام'' ہے جو تقریباً دو ہزار مصرعوں پر محیط ایک تمثیلی نظم ہے ۔یہ نظم ہیئت کا بھی ایک نیا تجربہ ہے جس میں مختلف اوزان و بحور بھی استعمال کیے گئے ہیں اور

ہندوستانی سماج خصوصاً بنگال کی بھوک، غربت اور بدحالی کا منظر پیش کر کے فرنگی استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے بغاوت اور انقلاب کو روشنی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ نظم کے کردار جاوید اور مریم بھی علامتی کردار ہیں جو سماج کو بدلنے کے لیے جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ جاوید اور مریم کا رومانس، ان کی شادی، جاوید کی انقلابی فکر، انقلاب کے لیے جان دینے کا منظر اور اپنے ہونے والے بچے کے نام آخری خط سب کچھ علامتی سطح پر اس نظم میں پیش ہوا ہے اور تاریخی جدوجہد، قوتِ نمو اور زندگی کے تسلسل اور ارتقا کا ضامن بن گیا ہے۔ نظم میں ظلم و بربریت اور استحصال کا منظر نامہ کس طرح پیش ہوا ہے اس کی ایک جھلک ہمیں مندرجہ ذیل اشعار میں ملتی ہے۔

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں
سیہ عقاب، سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ چیخیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے

(''نئی دنیا کو سلام''، ص ۳۸)

اس طرح نظم کے ابتدائی حصے (حرفِ اول) میں برطانوی استبداد کے تاریک دور کی تصویر کشی سیاہ رنگ سے کی گئی ہے اور تمام اشیاء، مناظر، احوال و کوائف اور تمام افعال و اعمال سیاہی میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں گویا بقول احمد ہمدانی سیاہی ظلم و استبداد کے ساتھ ساتھ نکبت و پریشان حالی کا استعارہ بھی ہے(۹)۔

نظم رومان اور انقلاب کی وادیوں سے گزرتے ہوئے تسلسلِ حیات، سماجی ارتقا، جہد و عمل اور آزادی کے لیے سرگرمِ پیکار ہونے کا درس دیتی ہے اگرچہ ناقدین نے اور خاص طور پر علی سردار جعفری نے خود اسے تمثیلی نظم کہا ہے لیکن پروفیسر ساجدہ زیدی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اسے ایک کامیاب منظوم ڈرامہ قرار دیا ہے جس کے کچھ حصے اسٹیج پر پیش بھی ہو چکے ہیں۔ اس نظم میں جاوید، مریم، فرنگی اور نامہ بر کے علاوہ تاریخ، زندگی اور موت کے علامتی کردار بھی موجود ہیں۔ عشق و رومان، سیاسی فکر، عوامی بیداری، انقلابی جدوجہد، عدل و انصاف اور انسانی حقوق کے موضوعات سے تشکیل پاتی ہوئی یہ نظم انسانی عظمت، ذوقِ نمو اور معاشرتی ارتقا کا استعارہ بن گئی ہے۔

سیاسی موضوعات پر لکھی ہوئی طویل نظموں کی بات ہو تو ن۔م۔راشد کی مشہور نظم ''ایران میں اجنبی'' بھی ذہن میں آتی ہے۔ یہ نظم تیرہ حصوں میں منقسم ہے جنھیں راشد نے 'کانتوز' کا نام دیا ہے۔اس نظم کے تیرہ حصوں کے عنوانات ''من وسلویٰ''، ''میزبان''، ''نارسائی''، ''کیمیا گر''، ''ہمہ اوست''، ''مارِ سیاہ''، ''دستِ ستمگر''، ''درویش''، ''خلوت میں جلوت''، ''تیل کے سوداگر''، ''وزیرے چنیں''، ''شارخِ آہو'' اور ''تماشا گہہِ لالہ زار'' ہیں۔یوں تو راشد نے بھی کئی طویل نظمیں لکھیں جن میں ''حسن کوزہ گر''، ''شہرِ وجود اور مزار'' اور ''گماں کا ممکن'' شامل ہیں لیکن ایران میں اجنبی کا حوالہ خالصتاً سیاسی ہے۔راشد نے اپنے تیسرے مجموعے ''لا-انسان'' کے دیباچے میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں تیس کانتو لکھنا چاہتے تھے لیکن صرف تیرہ حصے ہی لکھ سکے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ن۔م۔راشد کو برٹش انڈین آرمی کی جانب سے انٹر سروسز پبلک ریلیشننگ آفیسر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا یہ وہ دور تھا جب دوسری جنگِ عظیم جاری تھی اور ایران رضا شاہ کبیر کی قیادت میں بڑی طاقتوں کی باہمی آویزشوں سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا ایسے میں برطانوی، روسی اور امریکی افواج ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو تین طرف سے ایران میں داخل ہوئیں تا کہ روس پر حملہ آور جرمن افواج کے خلاف ایک مشرقی محاذ کھولا جا سکے اس صورتِ حال کے نتیجے میں ایرانی معاشرہ ابتری کا شکار ہوا اور راشد جیسے حساس تخلیق کار کا ایک اجنبی (برطانوی فوج کے نمائندے) کی حیثیت میں ایران میں ورود اُن کے خلاق ذہن کے لیے تازیانے کا سبب بنا۔ان تیرہ خاکوں میں دیس دیس کے کردار ہیں اور ایرانی تہذیب پر جنگ کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ان تیرہ نظموں کے کل مصرعوں کی تعداد آٹھ سو چودہ (۸۱۴) بنتی ہے اور یہ ایک بڑے کینوس پر لکھی گئی نظم ہے اور اس کے تیرہ قطعات خیال کے ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔پہلی ہی نظم ''من وسلویٰ'' میں راشد نے عہدِ موجود میں داریوش اور نوشیرواں عادل جیسے عظیم حکمرانوں کی سرزمین کو ابلتا ہوا ناسور قرار دے کر اپنے وجود کے حوالے سے سامراج کی نمائندگی پر معذرت اور کرب کا اظہار کیا ہے اور اس کا سبب ہندوستان پر برطانوی سامراج کی رہزنی کو قرار دیا ہے۔

مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

(کلیاتِ راشد، ص ۱۹۲)

ایشیائی اقوام کی سستی اور کاہلی اور ہندوستانی اقوام کی بے خبری کو فرنگی استعمار کی توسیع پسندی کا سبب قرار دیتے ہوئے مشرق کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے کھلنے کا ایک ہی راستہ بتایا ہے اور وہ ہے مشرقی اقوام کا اتحاد۔تیسرے

کانتو ''نارسائی'' میں راشد کہتے ہیں۔

میں کرتا رہا ہند و ایراں کی باتیں:۔
''۔۔۔۔۔اور اب عہدِ حاضر کے ضحاک سے
رستگاری کا رستہ یہی ہے
کہ ہم ایک ہو جائیں، ہم ایشیائی!
وہ زنجیر، جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے

تو آؤ کہ ہے وقت کا یہ تقاضا
کہ ہم ایک ہو جائیں۔۔۔ہم ایشیائی!''

(کلیاتِ راشد، ص ۲۰۱)

''ایران میں اجنبی کی تمام تیرہ نظموں پر تو یہاں تفصیلی اظہارِ خیال ممکن نہیں لیکن ''تماشا گہہِ لالہ زار'' ایران کے ماضی کی گمشدہ شان و شوکت اور اپنی قدیم تہذیب کے زوال کی داستان سناتی ہے جب کہ ''تیل کے سوداگر'' اس سلسلے کا ایک اور اہم کانتو ہے جس میں مغربی اور روسی افواج کی آمد کے بعد سامراجی رویے کا شکار ایرانی قوم کا ذکر ہے اور خاص طور پر اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب ایران سامراجی دباؤ کے نتیجے میں اشتراکی روس کے ساتھ تیل کی تلاش کا ایک معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسی لیے فتح محمد ملک نے اپنے مضمون ''راشد کی استعمار شناسی'' میں خیال ظاہر کیا ہے کہ تیل کے سوداگروں کے بھیس میں دوستی کے لبادے پہن کر آنے والے مہمان اپنی سامراجی حکمتِ عملی کے ذریعے اپنے میزبانوں کی آزادی و خودمختاری سلب کر کے اور ان کا شیرازہ بکھیر کر روحِ حیات کو فنا کر دیتے ہیں۔ راشدؔ کے نزدیک ایشیائی اتحاد و عمل کا راستہ ہی اس مردہ اور غلام زندگی سے نجات کا راستہ ہے (۱۰)۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعیں،
انھیں سے وہ خوشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے

جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں

(کلیاتِ راشد، ص ۲۳۸)

''کیمیا گر'' رضا شاہ پہلوی کے حوالے سے اور ''ہمہ اوست'' اشتراکی تصور سے اختلاف کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں اور ان میں اشتراکیت اور ملوکیت کے خلاف ایک احتجاجی رویّے کے ساتھ ساتھ انسانی خوابوں اور گلرنگ امیدوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ''تماشا گہہِ لالہ زار'' میں وہ کہتے ہیں۔

ہمارے نئے خواب کابوسِ ماضی نہیں ہیں
ہمارے نئے خواب ہیں، آدمِ نو کے خواب
جہانِ تگ و دو کے خواب
جہانِ تگ و دو مدائن نہیں
کاخِ فغفور و کسریٰ نہیں
یہ اس آدمِ نو کا ماویٰ نہیں
نئی بستیاں اور نئے شہر یار
تماشا گہہِ لالہ زار

(کلیاتِ راشد، ص ۲۴۹)

دراصل راشد کا جسم تو ایک فوجی کا ہے اور فوجی بھی ایسا جو دشمن کے لشکر سے وابستہ ہونے کی وجہ سے احساسِ ندامت کا شکار ہے کیونکہ دل وہ ایک شاعر کا رکھتا ہے اور شاعر آزاد ذہن کا مالک ہوتا ہے شاعر کے نزدیک آزادی کا یہ تصور سیاسی ہی نہیں بلکہ ذہنی، تہذیبی اور فنی صورتِ حال سے بھی وابستہ ہوتا ہے اسی لیے مظفر علی سید نے نظم ''ایران میں اجنبی'' کو خاص حالات کے تحت پیدا ہونے والی جذباتی کشمکش کے تجزیے کی ایک ایسی کوشش قرار دیا ہے جو انفرادی جذبات کی کشیدہ کاری سے اس زمانے کی سیاست کے پردے پر بکھرے ہوئے نقوش کی صورت میں منعکس ہوئی ہے(۱۱)۔

ابنِ انشاء نے بھی کئی طویل نظمیں تخلیق کیں جن میں ''بغداد کی ایک رات''، ''مضافات''، ''امن کا آخری دن'' اور ''کوریا کی لڑائی''، براہ راست سیاسی صورتِ حال سے تعلق رکھتی ہیں ''مضافات'' ایک پابند نظم ہے۔ پہلا شعر ایک مطلع ہے اس کے بعد نظم کے پانچ حصے ہیں۔ ہر حصے میں تین تین اشعار کے پانچ بند ہیں اس طرح یہ نظم چھہتر (۷۶) اشعار پر محیط ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے ایک حسین اور طویل نظم لکھنے کا وعدہ کرتا ہے تاکہ وقت کے بہتے ہوئے دریا میں اس کے بے قرار دل کو قرار آجائے وہ مضافات کی جانب نکل جاتا ہے تاکہ وہاں کی شفاف اور کھلی فضا اُس کے تخیل کے لیے مہمیز کا

کام دے۔ باہر کی ریاکاریوں سے دور اور غریب الوطنی کے الم ناک احساس سے چور چور دل لے کر شاعر مضافات کی طرف نکل تو آیا ہے لیکن اسے احساس ہوتا ہے کہ جگہ بدلنے سے دل کی وحشت کم نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ مضافات کے خاموش اور پرسکون ماحول میں آ کر بھی وہ ایک حسین نظم نہیں لکھ سکتا کیونکہ یہاں کی کھلی فضائیں بھی بارود کی بو سے مسموم ہو چکی ہیں۔ کوریا کی خانہ جنگی نے دنیا کو ایک مرتبہ پھر جنگ اور تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، ساری شمعیں گُل ہو چکی ہیں، انصاف اور دیانت کے علم بردار رخصت ہو چکے ہیں اور جس طرف بھی دیکھیں شورِ قیامت برپا ہے ایسے وقت میں شاعر کسی محبوبہء دل نواز کی زلفوں کی طرح نظم لکھنے اور شاعری کی دل فریب وادیوں میں جانے کا خواب کس طرح دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی ان لمحات میں جب صرف اس کے وطن پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر امن کے بجائے جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور انصاف کی آواز کہیں گم ہو چکی ہے اس حوالے سے مختلف اشعار

میڈرڈ اب بھی ہمہ وقت لہو روتا ہے
وادیاں بارسلونا کی ہیں زنداں اب تک

(چاند نگر، ص ۱۵۹)

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظم حسیں لکھوں گا
پر یہ کس سمت سے آنے لگی بارود کی بو
کوریا دور ہے، اتنا بھی مگر دور نہیں
کھیت اجڑتے ہیں، زمیں بھنتی ہے، بہتا ہے لہو

(چاند نگر، ص ۱۶۱)

''امن کا آخری دن'' ایک اور طویل نظم ہے جس کے بارے میں ابن انشاء نے ''چاند نگر'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''میں نے اس نظم میں پنجابی کی صنف سی حرفی کو آزمایا ہے۔ (۱۲)''

اس نظم میں تین تین اشعار کے تیئیس (۲۳) بند اور انہتر (۶۹) اشعار ہیں اور موضوع اس کا بھی وہی جنگ، اس کی ہولناکیاں اور انسانیت کے مستقبل کے حوالے سے پیدا ہونے والے اندیشے ہیں کیونکہ شاعر کا خیال ہے کہ اب تو چاروں طرف سے جنگ کی خبریں ہی چلی آتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اخبار کی ایک ایک سطر بارود کی بو سے آلودہ ہو چکی ہے۔ جنگ انسانی بستیوں پر شب خون مارتی ہے اور اس کا نتیجہ قتل و غارت، معاشی بدحالی اور قحط و افلاس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب جنگ کی افتاد پڑتی ہے تو انسانیت تباہی و بربادی کے سیلِ رواں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے، بچے یتیم ہو جاتے ہیں، سہاگ اجڑ جاتے ہیں، بوڑھے بے سہارا ہو جاتے ہیں اور پورا معاشرہ ایک اعصابی اضمحلال سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ابنِ انشاء نے سہ حرفی کی صنف سے کام لیتے ہوئے حروفِ تہجی کا سہارا لیا ہے اور انھی حروفِ تہجی کی مدد سے جنگ کے دردانگیز اور جاں کاہ عمل کا منظر نامہ پیش کر دیا ہے۔

الفؔ آندھیؔ ہے کہ مغرب سے اٹھا چاہتی ہے
الفؔ امیدؔ چراغِ تہہ داماں ہے ابھی

(چاند نگر، ص ۱۶۵)

تؔ وہ تمغہؔ ہے کہ برسوں کی ریاضت سے ملے
اور کسی لاش کی چھاتی پہ چمکتا رہ جائے

(چاند نگر، ص ۱۶۶)

گؔ گبروؔ ہے کہ بائیس بہاروں میں پلے
لؔ لاشہؔ ہے کہ دو روز کے اندر سڑ جائے

(چاند نگر، ص ۱۷۲)

اس طرح ایک ایک حرفِ تہجی کا استعمال کرتے ہوئے شاعر جنگ کی عبرت ناک داستان کا ایک ایک ورق پلٹتا جاتا ہے۔ ابنِ انشا کی مشہور طویل نظم ''بغداد کی ایک رات'' الف لیلائی اور داستانوی اسلوب میں لکھی ہوئی ایک بہت اثر انگیز نظم ہے۔ اپنے موضوع اور اپنی شعری جمالیات کی بناء پر یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم کا پہلا بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ چار حصے ہیں اس طرح ابتدائی پانچ مصرعوں کو الگ کر کے اشعار کی کل تعداد ایک سو تینتالیس (۱۴۳) ہے۔ ابنِ انشاء کے مطابق انھوں نے یہ نظم ۱۹۴۵ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کی اور اس کی تکمیل چار سال میں ۱۹۴۹ء میں ہوئی جب ان کی عمر صرف بائیس سال تھی۔ نوعمری کے اس دور کی فطری رومانیت اور جذباتیت ہی کا اثر تھا جس نے ابنِ انشاء سے عالمی سیاسی افق اور معاشی صورتِ حال کے حوالے سے یہ خوب صورت نظم لکھوائی جو ایک ایسے منفرد لہجے کی غماز تھی جس نے جدید نسل کے شعرا کے حوالے سے نئے امکانات کو تازہ کیا۔

نظم میں شاعر کا وجود سند باد جہازی کی طرح اپنے خیالوں کے سفینے پر سوار ہو کر بستی سے دور نکل آتا ہے۔ کبھی اسے آلِ برمک اور بنی عباس کے دور کا بغداد یاد آتا ہے جو بلادِ اسلامیہ کا عظیم ترین مرکز تھا اور کبھی الف لیلوی دور کا عیش و عشرت یاد آتا ہے جب انسانی تہذیب عہدِ جدید کی سیاسی چالبازیوں اور معیشت کی حیلہ گری اور ریاکاریوں سے دور تھی لیکن محفلِ عیش کے باہر کھڑا پہرے دیتا اور اپنے آنسو پیتا ہوا حبشی غلام اس کے تصور میں آ کر اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ کوئی بھی دور انسان کے استحصال سے خالی نہیں رہا اور ہر دور میں حکمران طبقے نے اپنی محفلِ طرب آراستہ کرنے کے لیے

عوام النّاس کو جبر کا نشانہ بنایا ہے۔

ابنِ آدم کا جہاں ۔۔۔دردِ ازل کا محور
قیدِ غم سے کبھی آزاد بھی ہوگا یا نہیں
حسرتیں دل میں پلے جائیں گی کب تک آخر
یہ خرابہ کبھی آباد بھی ہوگا کہ نہیں

(چاندنگر،ص ۱۲۲)

ابنِ آدم کے نکبت وافلاس کے حوالے سے مایوسی کی یہ لہر اس وقت ایک نیا رخ بدلتی ہے جب مسافر بغداد کی اس خیال انگیز رات میں نئی صبح کے آثار دیکھتا ہے اور مئوذن کی پکار اور اس کی آواز کا ترنم اور گداز اس سے یہ کہتا ہے کہ بس یہیں بیٹھا رہوں لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر تیل کے کنوؤں کی طرف جانا ہوگا کیونکہ تعطیل کے دن ختم ہوئے وہی دھواں اگلنے والے تیل کے چشمے،فضاؤں میں ان کی پھیلی ہوئی بو،وہی قلیل اجرت اور خواجہ کے محلوں میں وہی سونے کے انبار۔بغداد کی ایک رات کا یہ مسافر نظم کے تیسرے حصے میں الف لیلوی دور سے باہر نکل کر عہدِ حاضر کے معاشی استحصال کی داستان چھیڑتا ہے اور خواجہ کی علامت استعمال کرتے ہوئے امریکی و برطانوی سماج کی صد رنگ سیاست اور سیاست و معیشت پر تیل کے تاجروں کی اجارہ داری کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

اور یہ خواجہ کہیں افرنگی ،کہیں امریکی
جس کی صد رنگ سیاست کا طلسمِ سیمیں
تسمہ پا بن کے ہے مشرق کی فضاؤں پہ سوار
کب تک اس سحر کا معمول رہے گی یہ زمیں

(چاندنگر،ص ۱۳۴)

اسی عالم میں اس کی مایوسی کا سلسلہ اور دراز ہو جاتا ہے جب وہ سوچتا ہے کہ اب وہ خوب صورت بغداد کہاں جو شہر زادوں کا تخیل تھا۔اب بغداد کی تباہی کے لیے بخارا و سمرقند کی راہوں سے کسی ہلاکو یا کسی تاتاری لشکر کی آمد کی ضرورت نہیں ،اب تو بغداد کا حسن تباہ کرنے کے لیے امریکی و فرنگی سامراج کی آنکھوں کا اشارہ ہی کافی ہے۔مصر و شام اور بصرہ و موصل و بغداد سب پر اسی 'انکل سام' کا سکہ چلتا ہے اور عرب حکمران تیل کی تجارت اور ڈالر کی کرامت کے اسیر ہو چکے ہیں گویا عالمی رہزن بے پناہ لوٹ کھسوٹ کے بعد مشرق کو اقتصادی غلامی میں جکڑتے ہوئے سارے خطے کی صحافت،تجارت،سیاست اور اقتصادیات کے مالک و مختار بن بیٹھے ہیں اور اہلِ مشرق کٹھ پتلی کی صورت ان کے اشاروں

پر رقص کناں ہیں (۱۳)۔

ابنِ انشاء کے دوسرے شعری مجموعے ''اس بستی کے اک کوچے میں'' بھی تین طویل نظمیں ہیں۔ ''دیوارِ گریہ''، ''دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے'' اور ''یہ بچہ کس کا بچہ ہے''۔ ان نظموں میں بطور خاص ''دیوارِ گریہ'' اپنا ایک سیاسی پس منظر رکھتی ہے۔ ۱۵۹ مصرعوں پر محیط یہ آزاد نظم پانچ مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ اس نظم کی تخلیق جون ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ یہ نظم عالمی سیاست کے اس اہم واقعے کی جانب اشارہ کرتی ہے جب ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے نہرِ سوئز پر قبضے کے لیے مصر پر حملہ کر دیا تھا مشرقِ وسطیٰ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور نہر سوئز پر اسرائیلی فوج کے حملے کا مسئلہ اپنے عروج پر تھا۔ ایک سال تک نہرِ سوئز بند رہی تھی اور مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ساتھ یورپ پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے برسوں تک یہ کشیدگی جاری رہی اور آج بھی اپنے عروج پر ہے۔ اردن و مصر و شام کے شہداء کی جاں نثاری کے ساتھ ساتھ یہ نظم مقہور و مغضوب اہلِ یہود کے نہرِ سوئز پر خیمہ زن ہو جانے اور اہلِ عرب کے بے مکاں اور بے وطن ہو جانے کا دردناک نوحہ سناتی ہے۔

ایک دیوارِ گریہ بناؤ کہیں
یا وہ دیوارِ گریہ ہی لاؤ کہیں
اب جو اس پار بیت المقدس میں ہے
تا کہ اس سے لپٹ اردن و مصر کے، شام کے
ان شہیدوں کو یک بار روئیں
ان کے زخموں کو اشکوں سے دھوئیں
وہ جو غازہ میں لڑ کر
وہ جو سینائی کے دشت میں بے اماں
وحشی دشمن کی توپوں کا ایندھن بنے

(''اس بستی کے اک کوچے میں''، ص ۱۶۲)

یہ نظم آج کے سیاسی منظر نامے میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ آج مشرقِ وسطیٰ جس طرح زخم زخم ہے اور آج بھی مغرب اور اہلِ یہود کی سازشوں نے جس طرح وادیٔ سینا کو لہو رنگ کر رکھا ہے یہ نظم ان حالات پر بھی منطبق ہوتی ہے اور آج بھی ہر مسلمان کے دل میں اسی درد کو تازہ کرتی ہے۔

آج سینائی کی مسجدیں بے اذاں
آج سینائی میں عید صیہونیاں

روح قبلہ تپاں درد کی آگ میں
ہورہا ہے چراغاں سنا گاگ میں

(''اس بستی کے اک کوچے میں''، ص ۱۶۴)

ساحرلدھیانوی کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' بھی خاصی مشہور ہوئی۔ یہ نظم پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۹۵۹ء میں لاہور اکیڈمی نے شائع کیا۔ یہ نظم ایک سو چوراسی مصرعوں پر مشتمل ہے اور طوالت کے اعتبار سے دوسری نظموں کی ہم پلّہ نہیں ہے۔ نظم کی کہانی بہت سادہ مگر اثر انگیز ہے جس میں ایک فنکار چاندنی رات کے وجد آفریں لمحوں میں دو محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے تصورات کی پرچھائیاں گھیر لیتی ہیں۔ محبوبہ سے ملاقاتیں، شادی کے بعد رفاقت کی پُرکیف ساعتیں، نہ بچھڑنے کا یقین، بچھڑ جانے کا گمان، جنگ کی ہولناکیاں، موت کے سائے، معاشی بدحالی کے سلسلے، جان و مال کے ساتھ عفت و عصمت کے کھو جانے کا دکھ، تیسری عالمگیر جنگ کے آغاز کا اندیشہ اور محبت کرنے والوں کے خوابوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کا خوف، اس نظم میں بڑی بے خودی و ہشیاری اور مصورانہ چابک دستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے اثرات پوری دنیا کی طرح برصغیر کے معاشرے پر بھی مرتسم ہوئے۔ کاش مؤرخ کا قلم بڑے تاریخی واقعات کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی صداقتوں کو بھی منکشف کر سکتا جو جنگ کے بعد بھوک، افلاس، بدحالی اور جسم فروشی کی صورت میں بہت سے گھروں کا المیہ بن کر سماجی انتشار کا ذریعہ بن جاتی ہیں لیکن یہ گہری نظر تو صرف ایک حساس ادیب اور شاعر کے قلم کو ہی نصیب ہوتی ہے اور یہ نظر تو اتنی دوررس ہوتی ہے کہ بعد میں آنے والے واقعات کی جانب بھی پہلے سے اشارہ کر دیتی ہے۔

پچاس کی دہائی میں اس نظم کے اختتام پر ساحرؔ لدھیانوی نے تیسری عالمگیر جنگ کی صورت میں اپنے خوف کا اظہار اس طرح کیا تھا کہ

کہو، کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

(''پرچھائیاں''، ص ۴۷)

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

(''پرچھائیاں''، ص ۴۸)

آج تقریباً ساٹھ سال بعد ہم میں سے ایک ایک ہوش مند کیا ایٹمی اور خلائی جنگ کے اسی سیاہ بادل سے خوف زدہ نہیں جو ہمارے سر پر برسنے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ نظم اپنی ایک علیٰحدہ انفرادیت رکھتی ہے۔

علی سردار جعفری ''پرچھائیاں'' کے یباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''پرچھائیاں'' ساحرؔ کی بیشتر نظموں کی طرح محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور بیک وقت غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ وہ غنائی کیفیت جو بیانیہ عناصر سے آنکھ چراتی ہے بسا اوقات ذاتی داخلیت کے نہاں خانوں میں جلوے دکھا کر رہ جاتی ہے اور وہ بیانیہ کیفیت جو غنائی عناصر سے گریز کرتی ہے ایک طرح کی ظاہر نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی مثال ''نہر پر چل رہی ہے پن چکی'' سے بہتر نہیں ہوتی۔ ساحرؔ کی یہ نظم اس کی پوری شاعری کی طرح ان دونوں عیبوں سے پاک ہے۔(۱۴)''

جدید اُردو نظم کی تاریخ میں اختر الایمان کا نام ہمیشہ بہت اہمیت کے ساتھ لیا جاتا رہے گا انھوں نے بھی کئی طویل نظمیں لکھیں لیکن سیاسی حوالے سے اختر الایمان کی طویل نظم ''سب رنگ'' کا ذکر ضرور ہونا چاہیے جس کا سنِ تخلیق ''کلیاتِ اختر الایمان'' میں ۱۹۴۳ء اور سنِ اشاعت ۱۹۴۷ء درج ہے۔ ساڑھے پانچ سو سے زائد مصرعوں کی اس ڈرامائی نظم کا بنیادی کردار بھی آدم ہے اگرچہ یہ آدم کے آفاقی تصور سے مختلف ہے۔ ''سب رنگ'' چھ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا اور آخری حصہ ''افتتاحیہ'' اور ''اختتامیہ'' کے عنوان سے ہے جس میں زمان و مکاں کردار بن کر نمودار ہوتے ہیں جب کہ پہلا رنگ، دوسرا رنگ، تیسرا رنگ اور چوتھا رنگ کے عنوان سے بقیہ چار حصوں میں کرداروں کے مکالمے ہیں۔ نظم کو مکمل طور پر ڈرامائی رنگ دینے کے لیے مقام اور وقت کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ مقام: براعظم ایشیا کا ایک جنگل، تماشائی: شجر و

حجر، وقت: اندھیرے اور اجالے کے درمیان، زمانہ: ہمارا اور آپ کا۔ اس طرح نظم کے قاری کے لیے ذہنی طور پر ایک فضا تیار کی گئی ہے۔

آدم اور قوتِ حیاتِ نمو کے علاوہ اس میں مختلف جانوروں کے کردار ہیں یہ سارے کردار تمثیلی ہیں اور کرداروں کا تعارف کرواتے وقت ان کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے مثلاً سانپ (سیاسی رہنما)، خچر (والیء ریاست)، کتا (خطاب یافتہ)، بیل (محنت کش)، گدھا (پٹا ہوا شہزادہ) اور گدھ (سرمایہ دار) وغیرہ۔ نظم کی کہانی معنی خیز ہے اور اس دور سے وابستہ ہے جب جنوبی ایشیا پر انگریزوں کی حکمرانی تھی اس لیے آدم کا کردار انسان کے آفاقی کردار کی نشان دہی نہیں کرتا بلکہ جنوبی ایشیا میں آنے والے بدیسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جنگل کی تفصیلی وضاحت بھی ابتدائیہ میں کی گئی ہے یعنی اس جنگل میں سونے کی لالچ میں بہت سے لوگ آئے۔ ان مئورّخوں اور سیاحوں کو یہ تو علم تھا کہ یہ جنگل جانوروں سے بھرا ہوا ہے لیکن اس دریافت کا سہرا موجودہ آدم کے سر جانا چاہیے جس نے یہ پتہ لگایا کہ ان جانوروں کو خوف اور لالچ سے رام کیا جا سکتا ہے (۱۵)۔

نظم کا آغاز زمان و مکاں کے درمیان مکالموں سے ہوتا ہے۔ گنگا اور جمنا کی وادی میں برسنے والے بھورے بادل اور اُتّر سے اٹھنے والے بادلوں کے لشکر سے مراد جنوبی ایشیا کے نئے اور پرانے باشندے ہیں اور طوفان سے مراد بدیسی سامراج ہے۔

کنڈلی جو مار کے بیٹھوں تو سمٹ جائے زمیں
ڈس کے پلٹوں جو کسی کو وہیں افسانہ بنے
میرا ڈسنا، مری پھنکار، مرا رقصِ حسیں
سب ہیں ذو معنی انھیں جان سکو گے تم کیا
زہر اگلوں تو جھلس جائیں مکاں اور مکیں
غالباً تم ابھی واقف نہیں اس بھید سے بھی
زہر کی لاگ بنا کوئی سیاست ہی نہیں

(کلیاتِ اختر الایمان، ص ۱۱۰)

اگرچہ یہ نظم اختر الایمان کی کمزور نظموں میں شمار ہوتی ہے لیکن ڈرامائی کہانی کی صورت میں یہ نظم جنوبی ایشیا کی مخصوص سیاسی اور سماجی صورتِ حال کا اعلامیہ ہے جس میں سیاسی رہ نماؤں کی منافقت، جاگیردار اور خطاب یافتہ طبقے کی

چاپلوسی، سرمایہ دار طبقے کی مکاری، حکمران طبقے کے ظلم و جبر، غیر ملکی استحصال اور نوآبادیاتی نظام کی ریشہ دوانیاں، صبر و شکر کے نام پر محنت کش طبقے کی پسپائی اور عوام کی خامشی اور بزدلی کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ پوری کرب ناک صورت حال سامنے آجاتی ہے۔

''تاریک سیّارہ'' اختر الایمان کی درمیانے درجے کی طویل نظم ہے جو بیس بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں چار مصرعے ہیں جو اب اور ج ب کی ترتیب میں ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی مایوسی کی صورت حال اور اس تناظر میں خوابوں اور حقیقتوں کے تصادم کا منظر نامہ اس نظم سے ظاہر ہے کیوں کہ نظم کے عنوان کے ساتھ ہی حریفِ اول: خواب اور حریفِ دوم: حقیقت کے الفاظ درج ہیں۔ نظم میں دو کرداروں کے درمیان مخاطبے کی تیکنیک استعمال کرتے ہوئے زندگی کی روشن اور تاریک تصویر دکھائی گئی ہے۔ نظم ''تاریک سیارہ'' دوسری جنگِ عظیم کے آخری دور کی کرب ناک اور حسرت ناک صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتی ہے جب ہر حساس اور دردمند دل حیات آفرینی کے لمحات کو ترس رہا تھا اور ایک ذہنی کشمکش کا شکار بھی تھا۔ اختر الایمان نے اس نظم کے کرداروں کے ذریعے انسانی سماج کے دو متضاد رویوں کی نشان دہی کی ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ انسانی سماج میں برپا ہونے والے قیامت خیز ظلم، جبر اور غموں سے موڑ کر کیوں نہ محبت، رومان اور خواب کی دنیا میں پناہ لی جائے، زمین تو اب رہنے کے قابل نہیں رہی لہٰذا نئے سیاروں کو تلاش کیا جائے اور خارج سے ناطہ توڑ کر داخل کی طرف مراجعت کی جائے جب کہ دوسرا رویہ یہ ہے کہ انسان خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر عمل اور حقیقت کی دنیا میں واپس آئے، آسمانوں، ستاروں اور نادیدہ بہاروں سے کھیلنے کے بجائے پورے خلوص کے ساتھ اپنے داخل کی روشنی سے خارج کے اندھیروں کو مٹانے کی کوشش کرے، اس خاک داں کی بہار آفرینی کو سنبھال کر رکھے اور انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائے۔

ظلمتِ شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن
اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرہ و تار

(کلیاتِ اختر الایمان، ص ۱۸۵)

حمایت علی شاعر کی طویل نظموں میں ''شعلۂ بے دود''، ''بدلتے زاویے''، ''شکست کی آواز'' اور ''حرف حرف روشنی'' شامل ہیں خاص طور پر ان کی طویل منظوم سوانح ''آئینہ در آئینہ'' بہت مشہور ہوئی جو خاصی طویل ہے اور ساڑھے تین ہزار اشعار پر محیط ہے لیکن سیاسی فکر کی نسبت سے ان کی طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کو بھی شہرت حاصل ہوئی جو

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء کے درمیان لکھی گئی اس پابند نظم میں دوسو پچھتر (۲۷۵) اشعار ہیں اور اس کے بارہ حصوں کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) یادوں کے غبار (۲) ایک مسرت، ایک موت (۳) غمِ حاصل (۴) وداع (۵) جنگ کے میدان میں (۶) آگ میں پھول (۷) جب شعلے بجھ گئے (۸) اپنا وطن (۹) اپنا گھر (۱۰) حاصلِ غم (۱۱) دوسری زندگی (۱۲) دوسری موت۔ نظم صیغہء واحد متکلم میں لکھی گئی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے۔ آپ بیتی سنانے والا یہ فرد بنگال کا دہقان بھی ہوسکتا ہے اور کوریا کے محاذ پر لڑنے والا ایک سپاہی بھی جسے تقدیر نے جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔

یہ نظم قحطِ بنگال اور کوریا کی جنگ کے تناظر میں لکھی گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران (۱۹۴۲ء۔ ۱۹۴۳ء میں) فرنگی سامراج کی غلط پالیسیوں کی بدولت بنگال میں خوف ناک قحط آیا جس میں چالیس لاکھ افراد لقمہء اجل بنے۔ کوریا کی جنگ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک جاری رہی جس میں دونوں فریقین کے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ افراد موت کا شکار ہوئے زخمیوں اور گمشدہ افراد کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

نظم کا واحد کردار اپنی یادوں کے غبار سے نکلتا ہوا اُس مسرت کو یاد کرتا ہے جب اس کے خوابوں کے اجڑے آنگن میں اُس کی شامِ تنہائی کسی کے حسین پیکر سے آباد ہوئی اور زندگی کو کوئی ہم سفر ملا مگر غربت اور بھوک کی بادِ صرصر نے زندگی کے حسین پیراہن کو نوچ کر رکھ دیا، احساس وفکر اور ذہن وضمیر کی سطح پر غلامی مقدر ہوئی اور وہ اپنی قسمت پر شاکر رہا لیکن بھوک اور غربت کو مٹانے کے لیے جنگ پر جانے کا فیصلہ اور وداع ہونے کا منظر اس کے لیے سوہانِ روح بن گیا ،اپنے اہلِ خانہ سے جدائی اس کے دل میں نشتر چبھوتی رہی اور وہ محاذِ جنگ پر لپکتے برستے شعلوں میں زندگی کو موت کے سپرد ہوتے دیکھتا رہا ایسے میں آگ میں پھول کھلتے ہیں اور بیٹی کی پیدائش کی خبر ایک مرتبہ پھر دل میں امنگوں اور آرزوؤں کی شمع کو روشن کرتی ہے مگر چند سکوں کی خاطر اپنے پیاروں سے جدائی کا دکھ سہنے والا یہ کردار جب واپس آیا تو اس کے شہر کو بھوک نگل چکی تھی جگہ جگہ ایک پیالہ چاول کے عوض بکتے ہوئے لوگ اور انسانوں کے قحط زدہ جسم انسانیت کا مذاق اڑا رہے تھے ایک طرف جنگ کا محاذ تھا جہاں ہر طرف موت رقص کرتی تھی اور دوسری طرف اپنے وطن بنگال میں گزشتہ جنگ میں حاصل ہونے والے بھوک اور قحط کی بدولت لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے اور جب وہ اپنے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کے کئی رشتے بھوک کی نذر ہو چکے ہیں یہاں پر آکر نظم کا یہ کردار کہتا ہے۔

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا

ایک خوش حال زندگی کے لیے
جنگ کے کام آ کے کیا پایا

(''کلیاتِ شاعر''، ص ۴۵۶)

اپنی بچی کھچی کائنات کے لیے فکرِ معاش میں مبتلا یہ کردار امید اور نا امیدی کی کشمکش میں زندگی بسر کرتا ہے، کبھی جینے کا حوصلہ ختم کر دیتا ہے اور کبھی اپنی بیٹی کی خاطر عنانِ عزائم سنبھال لیتا ہے برسوں بعد اس کی بیٹی کی رخصتی کا وقت اس کے لیے دوسری مسرت بن کر آتا ہے اور ساتھ ساتھ خوف اور اندیشوں کا زہر بھی رگ رگ میں سرایت ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے۔

آج پھر کچھ خدائے دولتِ ارض
نقشِ ہستی مٹائے جاتے ہیں
نت نئے کوریا۔۔ نئے بنگال
سولیوں پہ چڑھائے جاتے ہیں
کوئی سوچے، عروسِ فطرت کیوں
شام سے تا بہ صبح روتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

(''کلیاتِ شاعر''، ص ۴۶۵۔۴۶۶)

حمایت علی شاعر خود اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ کہانی آپ بیتی نہیں لیکن آپ بیتی ہو سکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ''میں'' بھی ہو سکتا ہوں اور آپ بھی۔۔۔ کیونکہ گزشتہ عالمگیر جنگ میں بنگال، جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا اس پس منظر کی روشنی میں اس کہانی کا مرکزی کردار ''انفرادی'' ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی کردار بھی ہے اور آج نئی عالمگیر جنگ کا ہولناک اندیشہ دنیا

کے ہر انسان کے دل میں ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے۔کیا ہماری نئی نسل بھی
جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟(۱۶)''

سلیم احمد کی نظم ''مشرق'' معیار اور طوالت ہر دو اعتبار سے اُردو کی ایک اہم طویل نظم ہے۔فصلِ اول میں گیارہ اور فصلِ دوم میں آٹھ نظمیں ہیں جن میں سے کچھ طویل ہیں اور کچھ طویل تر اور کچھ مختصر۔مشرق پابند اور آزاد نظم کا مرکب ہے اور مختلف بحور و اوزان میں لکھی گئی ہے تین ہزار سے زیادہ مصرعے اور ۵۷۰ اشعار پر محیط یہ نظم سلیم احمد کی روح کا رزمیہ ہے جسے وہ تین حصوں میں لکھنا چاہتے تھے۔''مشرق ہار گیا''،''مغرب'' اور ''رب المشرقین ورب المغربین'' جو اٹھائیس سے تیس ہزار مصرعوں پر محیط ہوتی لیکن بوجوہ وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔

فصلِ اول کی پہلی نظم ''مشرق ہار گیا'' (۵۳ مصرعے) درمیانے درجے کی طویل نظم ہے لیکن اثر انگیزی میں مشرق کے تمام حصوں سے زیادہ شدت رکھتی ہے اثر انگیزی کی یہ کیفیت دراصل احساس کی شدت سے مشروط ہے اور یہ نظم ضائع بدائع، تراکیب اور استعارات سے بڑی حد تک گریز کرنے کے باوجود قاری کے ذہن پر ایک دائمی نقش چھوڑتی ہے اس نظم کے ذریعے سلیم احمد کا رشتہ اکبرالہٰ آبادی کی فکر سے جُڑ جاتا ہے کیوں کہ سلیم احمد بھی اکبر کی طرح مغربی اقدار کی بالادستی نہیں چاہتے تھے البتہ سلیم احمد کے ہاں یہ فکر شدید دکھ کی کیفیت میں ظاہر ہوئی ہے۔

حالی کی مسدس میں بھی مشرق کی پسپائی کا یہ احساس نظر آتا ہے اور اقبال کی نظموں میں بھی یہ پیکار نمایاں ہے لیکن پسپائی اور احساس کمتری کے اس مرض کا علاج ان سب کے نزدیک جدید علوم و افکار سے آگہی کے علاوہ کچھ نہ تھا اس کے بر خلاف سلیم احمد اُس ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی فکر پر یقین رکھتے تھے جو برِصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل اس معاشرے کا لازمہ تھی اور جس کے نتیجے میں برِصغیر کے مسلمان حقیقتِ واحدہ کے حوالے سے عقیدے کی پختگی کے حامل تھے اور ان کا خیال تھا کی مغربی علوم و افکار آہستہ آہستہ ہماری روحانی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ لیں گے اور وہی ہوا۔سلیم احمد نے ''مشرق'' کے پیش لفظ میں تفصیل سے اس کے پس منظر پر نظر ڈالی ہے وہ پہلے خاکسار تحریک اور بعد میں مسلم لیگ سے وابستہ رہے لیکن پاکستان بننے کے بعد ایک عام پاکستانی کی طرح یہاں کی صورتِ حال کے حوالے سے اضطراب کا شکار رہے یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن آ گئے اور دائیں بازو کی عبرتناک شکست نے سلیم احمد کو پاکستان اور اسلام کے مستقبل سے مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے اضطراب میں مبتلا کیا کہ ۱۹۷۱ء میں ''مشرق'' ہار گیا تخلیق ہوئی لیکن بقول سلیم احمد یہ نظم پینتیس سال سے ان کی روح میں پک رہی تھی (۱۷)۔

سلیم احمد جب خاکسار تحریک میں تھے اُس وقت بھی اسلامی خلافت کا خواب دیکھا کرتے تھے۔اور جب علامہ

شبیر احمد عثمانی اور حسن عسکری سے متاثر ہو کر مسلم لیگ میں آئے تو مشرقی اقوام کی بیداری اور اسلام کی سربلندی کے لیے اُن کی تمام تر توقعات پاکستان سے وابستہ ہو گئیں جو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک بنتی، بگڑتی اور ٹوٹتی رہیں وہ تخلیق کار اور مستقبل شناس تھے اس لیے انھوں نے آنے والے بحرانوں کا اندازہ کر لیا تھا اسی لیے یہ نظم جب تخلیق ہوئی ہے تو اُن کا غصہ، اُن کا اضطراب، اُن کی روح کی تڑپ اور ان کی پوری لہو رنگ شخصیت اس میں نمایاں ہے اس لیے یہ نظم کامیابی کے ساتھ قاری کی روح کو بھی اسیر کر لیتی ہے اور بتاتی ہے بلکہ یہ اخلاقی اور روحانی اقدار و عقائد کی سطح پر ملنے والی ایک عظیم شکست ہے جس کا بھگتان کئی نسلیں بھگتیں گی۔

یہ بکسر اور پلاسی کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی کی رانی کی ہار نہیں ہے
سن ستاون کی جنگ آزادی کی ہار نہیں ہے
ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے

(''کلیاتِ سلیم احمد''، ص ۳۸۰)

نظم میں مشرقی کرداروں قبلائی خان اور اکبر اعظم کا علامتی ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مہابلی اور ظل اللہ کہلانے والے مشرق کے عظیم شہنشاہوں کے مقابلے میں مغرب کے کتے بھی افضل ہیں یہ بات شاعر کے غصے کی آگ کو مزید بھڑکاتی ہے اور وہ مشرق کی عظمت و رفعت کی توضیح کرتا ہے شاعر کی نظر میں مشرق افضل اور مغرب اسفل کیوں ہے کیونکہ مادی ترقی اور ارضی صورتِ حال ہی مغربی فکر کی منزل ہے جب کہ مشرق روح کو افضل اور جسم کو اسفل دارذل سمجھنے کی بناء پر ارضی اور زمینی صورتِ حال کو محض اپنے سفر کا ایک پڑاؤ سمجھتا ہے اور روحانی پاکیزگی اور فکر کی بلندی کو اہمیت دیتا ہے اس لیے مشرق کی یہ شکست اسے انسانیت کی شکست نظر آتی ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں۔

سورج مشرق سے نکلا تھا
لیکن مغرب ہر سورج کو نگل گیا ہے
''میں ہار گیا ہوں''
۔۔۔۔۔میں نے اپنے گھر کی دیواروں پہ لکھا ہے

''میں ہار گیا ہوں''
میں نے اپنے آئینے پر کالک مل دی ہے
اور تصویروں پر تھوکا ہے

(''کلیاتِ سلیم احمد''، ص ۳۸۱)

بتیس ابواب پر محیط جمیل الدین عالی کا طویل نظمیہ ''انسان'' جو ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا اگرچہ سائنسی عہد میں انسان کے قلبی اضطراب کا اعلامیہ ہے لیکن اس کے بھی کچھ ابواب جزوی طور پر سیاسی فکر کی عکاسی کرتے ہیں خاص طور پر نظم ''انسان'' کے بیسویں باب ''لام بندی'' کا آغاز ان مکالموں سے ہوا ہے

جمالی: کیا جنگ اسی صدی میں ممنوع ہو سکے گی
بوڑھا: شاید نہیں کہ اب تک انساں درندگی سے آزاد ہو نہ پایا
اور دور تک نہیں ہے ایسی ضرورتوں کے حق میں کوئی بھی سایا

(''انسان''، ص ۳۷۱)

''لام بندی'' اپنے احساس اور خیال کے اعتبار سے ایک منفرد نظم ہے اور غالباً پہلی مرتبہ اُردو شاعری میں یہ خیال پیش ہوا ہے اور وہ بھی ایک مرد تخلیق کار کے قلم سے۔ ''لام بندی'' کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مردوں نے صدیوں سے اس دنیا کو جنگ کے جس آزار میں مبتلا کر رکھا ہے اس نے مردوں کی جانوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بے چارگی، بے بسی اور تباہی و بربادی میں اضافہ ہی کیا ہے لیکن امید ہے کہ اگلی صدیوں میں عورتیں ہی جنگ کے خلاف آواز بلند کریں گی۔

بوڑھا: اب وقت آ رہا ہے
آثار ابھر رہے ہیں
جو عورتوں کو ان کا کردار دیں گے کوئی

(''انسان''، ص ۳۷۳)

شاعر نے اس نظم میں اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ میری خوش فہمی ہو لیکن یہ روشنی بھرا احساس ابھرا ہے کہ شاید اپنے ہی دائروں میں گھومتی ہوئی اور بے انقلاب رہ کر صدیاں گزارتی ہوئی عورت ہی اگلی صدیوں میں جنگ کے خلاف صف آرا ہوگی۔ بوڑھے اور جمالی کے مکالموں کے ذریعے بڑی سادگی سے اس احساس کو نظم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے بھی اس نظم کے حوالے سے یہی بات کہی ہے کہ مردوں کا فاتح یا مفتوح سپہ سالاروں کی طرح

تاریخ کے تھیٹر میں اسٹیج پر آنا اور عورتوں کا اپنی دنیا میں محدود ہونا کیا اس سوال کو جنم نہیں دیتے کہ اگر عورت کی حکمرانی ہوتی تو کیا انسان کی تاریخ مختلف نہ ہوتی؟ (۱۸)۔

بوڑھا نظم کے آخر میں خوش امیدی کا اظہار اس طرح کرتا ہے

میں کیا ازل کو سمجھوں
میں کیا ابد کو جانوں
کہلائیں گی وہ صدیاں
''ماؤں کا اک ترانہ''
ہاں ہاں عزیز میرا احساس کہہ رہا ہے
آئے گا وہ زمانہ

(''انسان''، ص ۳۷۵)

نظم کا تیئیسواں باب ''سب سے بڑا قاتل'' ایٹمی تباہی کے حوالے سے لکھا گیا ہے جس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا قاتل کون ہے؟ کیا اس میں سکندر و چنگیز و ہٹلر یا دوسرے حکمرانوں کے نام آئیں گے یا آشویز یعنی بدنامِ زمانہ جرمن مقتل گاہ کا ذکر آئے گا؟ نظم میں بوڑھا اور اَسرار اس بحث کا آغاز کرتے ہیں اور آخر اَسرار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امریکہ کے صدر ہیری ٹرومین ہی کا نام اس فہرست میں سب سے اوپر موجود ہے کیونکہ اس نے آٹھ دن کے اندر اندر ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم گرائے اس کی بدولت دس لاکھ سے زیادہ افراد دیکھتے دیکھتے لقمہء اجل بن گئے تین نسلوں تک ملک میں سرطان زدہ اور بیماریوں میں مبتلا افراد کی پیدائش جاپانی قوم کا مقدر بنی امریکہ لوگوں کو امن و آشتی کا فریب دیتا رہا اور ہیری ٹرومین کا نام کسی دیوارِ ظلم و جبر و قتال پر کندہ ہونے کے بجائے معتبر صدور کی فہرست میں شامل رہا۔ اس ایٹمی حملے میں امریکی صدر روز ویلٹ اور آئن سٹائن کا جو کردار تھا اس کا ذکر بھی اس نظم میں ہے۔

غریب مظلوم اور اتحادی بھی معترض ہوں تو بس یونہی اپنے شانے اچکا کے ٹال دینا
مثالِ انبوہِ صد بہائم یہ سارے جرموں میں بدترین ایٹمی جرائم
انھیں کچھ امریکی جنگجوؤں کے ظالمانہ بغیر منطق تحفظِ ناگزیر خانے میں ڈال دینا

(''انسان''، ص ۴۲۰)

آفتاب اقبال شمیم نے جو طویل نظمیں لکھیں ان میں سے ایک نظم ''ویت نام'' ''فنون'' لاہور کے نومبر دسمبر

۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی یہ ایک مکالماتی نظم ہے جس میں مختلف کردار ہیں۔ بوڑھا، مدوسا، میں، زید اور کچھ آوازیں۔ یہ نظم جنگِ ویت نام کے تناظر میں لکھی گئی ہے جو چھوٹے چھوٹے مناقشوں سے قطع نظر کینیڈی کے قتل کے بعد ۱۹۶۳ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۷۵ء تک جاری رہی اس جنگ میں آٹھ لاکھ سے زائد افراد موت کی نیند سو گئے اس جنگ میں جنوبی ویتنام کا ساتھ امریکہ نے دیا لیکن شمالی ویتنام کے ہاتھوں اسے بدترین شکست کا سامنا ہوا اور ہزیمت اٹھانا پڑی۔ نظم کا آغاز بوڑھے کے مکالموں سے ہوتا ہے جو جنگ کی صورتِ حال سے اس قدر وحشت زدہ ہے کہ اسے انسانی معاشرہ ایک جنگل نظر آتا ہے وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جنگلوں کی طرف مت جانا وہاں کی شاخیں اور پتے بھی خون آلود ہیں یہ نوجوان دراصل ویت نام کی فوج کے سپاہی ہیں جو امریکہ کی سفید فام فوج سے محاذ آراء ہیں اور جنگ کا ایندھن بن رہے ہیں۔

سنو سنو جنگلوں کی جانب ابھی نہ جاؤ
سفید کرگس
تمھارے جسموں کو نوچ لیں گے

(فنون، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۰)

مدوسا جو اپنے آپ کو آگ قرار دیتے ہوئے دوسروں کو بھی اپنے شعلوں میں مدغم ہو جانے کی دعوت دیتی ہے غالباً جنگ کی علامت ہے اور ہیوئے کے مقدس کاہن کو مخاطب کرتے ہوئے شہر کے کھنڈر ہوتے ہوئے مکانوں پر خندہ زن ہے اور سوال کرتی ہے کہ شہر خالی کیوں ہو گیا ہے؟ نظم میں اگلے دو کردار داخل ہوتے ہیں ''میں'' اور ''زید'' جو آپس میں ہمزاد ہیں اور ان افراد کا استعارہ ہیں جن کے لیے جنگ کا یہ منظر نامہ محض دھماکہ خیز خبروں سے عبارت ہے خاص طور پر زید کا خیال یہ ہے کہ دس برس میں دھوپ میں بیٹھ کر ناخنوں کی فصل کاٹنے کے باوجود کچھ حاصل نہ ہو سکا ایسے میں کورس آواز ابھرتی ہے جو ایک مرتبہ پھر جنگ کی ہولناکی کی طرف متوجہ کرتی ہے اور امریکہ کے سفید فام سپاہیوں کے حملے کو دھرتی کے لیے بدنما داغ قرار دیتی ہوئے انھیں سفید طاعون قرار دیتی ہے لیکن ساتھ ساتھ آنے والے موسموں کے لیے پرامید بھی ہے نظم کا واحد متکلم کردار امید اور ناامیدی اور وہم و گمان کی منزلوں سے گزرتا ہوا اس جنگ کے آخری جنگ ہونے کی امید ظاہر کرتا ہے۔

موت کی بادشاہت میں آنکھوں کے پرچم کو اونچا رکھو
قاف کی چوٹیوں پر کھڑے
سب نے سب سے ہمیشہ کہا

آخری جنگ کے بعد تو تا ابد نور ہی نور ہے
اے خدا! تیرے منشور و آیات کی خیر ہو
کیا یہی آخری جنگ ہے؟

(''فنون''، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۴)

مختلف آوازوں کے پردے میں ویت نام کی عظمت کا اعتراف بھی ہے اور ایسے میں بوڑھا ایک مرتبہ پھر ویت نامی نوجوانوں کو پکارتا ہے۔

جوان لڑکو! تمھاری مائیں
جلی ہوئی بستیوں کے ملبے پہ
آنسوؤں کی چمکتی مالائیں لے کے صدیوں سے منتظر ہیں
زمیں کو رعشہ سا ہو گیا ہے
تم آؤ گے اور تم نہ آؤ گے اور وہ منتظر رہیں گی

(''فنون''، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۵)

ادیب سہیل کی طویل نظم ''سمندر اور قطرے'' پانچ سو گیارہ (۵۱۱) مصرعوں پر محیط آزاد نظم ہے اور سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب و عوامل سے بحث کرتی ہے اور اس طرح تاریخی حیثیت اختیار کر جاتی ہے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ نظم ایک حوالہ بن سکتی ہے۔ ''سمندر اور قطرے'' کرداری اسلوب میں لکھی گئی ہے اس کا واحد کردار ایک علامتی نسائی کردار ہے جو ہجرتوں کے تسلسل میں محض جذبات کی آئینہ داری کرنے کے بجائے حقائق کا تجزیہ کر کے اپنے ہم زبانوں کی غلطیوں کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ کتابوں کی دکان پر سرِ شام ایک ضعیفہ کے کہے ہوئے چند جملے شاعر کے لیے اس نظم کا محرک بنے۔ نظم نسائی کردار کے اس احساس سے شروع ہوئی ہے جب اس کی ماں تقسیمِ ہند کے وقت یہ کہتی ہے کہ ہجرت کر لینی چاہیے کم از کم چین کی نیند تو سو سکیں گے۔ اس کے بعد استعاراتی انداز میں بنگلہ بولنے والوں کو سمندر اور ہجرت کر کے آنے والوں کو قطرے قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد نظم واقعات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ پہلے قائدِ اعظم کی ڈھاکہ آمد اور اُردو کو قومی زبان بنانے کا اعلان اور بعد کے برسوں میں مشرقی پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاری، مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کی منافع خوری اور مفاد پرستی، مقامی لوگوں کی بڑھتی ہوئی غربت اور اس سے جنم لیتی ہوئی بے چینی اور احساسِ کمتری، احتجاج اور مزاحمت کی

بڑھتی ہوئی لہر، غیر بنگالیوں کا احساسِ تفاخر، اس کے ساتھ ساتھ نظم میں پاکستان کے حکم رانوں، اربابِ اختیار اور بالا دست طبقے کی کورنگاہی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ وہ مسلک اور ثقافت کے رشتے سے نابلد اور نا آشنا اور بے بصیرت تھے اور اس حقیقت سے ناواقف کہ ثقافت کا زمین سے کتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ نظم اس حقیقت کا اظہار بھی کرتی ہے کہ تاریخ سے نابلد رہنے والے عافیت کوش ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کا بالا دست طبقہ یہ بھول گیا تھا کہ مٹی کی فطرت انسانوں کی فطرت پر یقینی طور پر اثر انداز ہوتی ہے جس طرح مشرقی پاکستان کی سرزمین تند خو موسموں کی زمین ہے اور وہاں موسم پل پل اپنے رنگ بدلتا ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کا مزاج بھی انقلابی ہے اور وہ ہمیشہ سے خود مختار سوچ کے حامل بھی رہے ہیں۔

یہ تاریخ سے نابلد ہیں
یہ مٹی کی فطرت سے کم آشنا ہیں
کہ یہ سرزمیں تند خو موسموں کی زمیں
غلامی کسی دور میں اس کو بھائی نہیں ہے
جو دریا میں ہیں وہ کنارے سے باغی
سدا اک نئے راستے کے سراغی
یہ موسم کا عالم
ابھی صاف مطلع
ابھی آسماں پر سحابوں کی وہ فیل مستی
یہ تاریخ ہے اس زمیں کی
کہ خلجی سے لے کر علی وردی خاں کے نواسے تلک
کم ہی ادوار ایسے
کہ جن میں رہا ربط مرکز سے اس کا
ہمیشہ تھی آزاد اور ''آپ مختار'' سلطان کی حکمرانی

(''بکھراؤ کا حرفِ آخر''، ص ۷۶۔۷۷)

وسائل کی تنظیم، مشرقی پاکستان کی افرادی قوت کے اعتبار سے پیداواری وسائل کی تقسیم، مقامی خود اختیاری

حکومت کا قیام یہ تھا وہ علاج جو اس نظم میں حقیقتِ حال کے تناظر میں اظہار کی راہ پاتا ہے مگر ساتھ ساتھ سیاست دانوں کی بے حسی اور بدترین انتظامی و معاشی کارکردگی، مغربی مفادات کا تحفظ، جمہوری نعروں کا فریب، ملک کے عسکری اور سیاسی طبقے کی ناعاقبت اندیشی، مصلحت کے بجائے ملٹری آپریشن کا راستہ اور عوامی مزاحمت سے چشم پوشی کے معاملات بھی بیان ہوئے ہیں جن کے نتیجے میں قوم پرستی کا نعرہ زور پکڑتا گیا اور ہندوستان کو مکتی باہنی جیسی تنظیموں کے ذریعے نفرت کی آگ بھڑکانے، آگ اور خون کی ہولی کھیلنے اور لسانی تعصّبات کی دیوار اٹھانے کا موقع ملا۔ نظم ان تمام حقائق کا تجزیہ کرتی ہوئی پھر اس نسائی کردار تک پہنچتی ہے جس کے شوہر اور بیٹے کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر اس کی ماں اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ ایک اور ہجرت کر کے کراچی چلتے ہیں جہاں کم از کم سر پر لٹکتی ہوئی تلوار تو نہ ہوگی۔ یہ نظم ۱۹۹۶ء میں شائع ہونے والے مجموعے ''بکھراؤ کا حرفِ آخر'' میں شائع ہوئی اور آج کراچی کے خونیں منظر نامے میں یہ نظم ایک مرتبہ پھر بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔

عقیل احمد فضا اعظمی نے بھی کئی طویل نظمیں تخلیق کیں جن میں ''کرسی نامہء پاکستان'' پانچ سو سے زائد مصرعوں پر مشتمل ایک آزاد نظم ہے۔ یہ نظم پاکستان کی سیاسی تاریخ کا اشاریہ ہے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کی قیادت جن ناعاقبت اندیشوں کے ہاتھ میں آئی اور جمہوریت اور آمریت کی کشمکش میں جو سیاسی انتشار ہمارے حصے میں آیا یہ نظم اسی المیے کو دہراتی ہے۔ فضا اعظمی کی ایک اور طویل معرّیٰ نظم ''عذابِ ہمسائیگی'' پاکستان اور بھارت کے روایتی تعلقات کے پس منظر میں لکھی گئی۔ نو سو اسّی (۹۸۰) مصرعوں کی اس نظم میں شاعر کا لہجہ احتجاجی یا مزاحمتی نہیں بلکہ شکایتی ہے۔ شاعر نے ہند آریائی تہذیب کی عظمت اور ہندومت کے اعتقادی فلسفوں کی وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہندوستان میں پائیدار جمہوریت، اقتصادی پیش رفت اور اشتہاری تجارت میں بھارت کی برتری کو تسلیم کیا ہے نظم میں کہی گئی بعض باتوں سے اتفاق اور بعض سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مذہبی تعصّبات کے فروغ اور ہندوستان کے شغلِ دست اندازی کی شکایت اور قومی سطح پر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ احساس دلایا گیا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے عوام کے درمیان جو ثقافتی اور سماجی رشتے ہیں انھیں پر امن بقائے باہمی کے ذریعے ہی مضبوط کیا جا سکتا ہے لیکن دونوں اقوام ابھی تک بدیسی قوتوں کے سازشی ذہنوں کی کارفرمائی کے لیے محض ایک آلہء کار ہیں۔

تو ان بکھرے ہوئے خوابوں کے اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کی نسبت سے
ہمارے چند شکوے ہیں ہمارے چند نالے ہیں
انھیں سن لو کہ یہ شاید دلوں کے تار کو چھو لیں

انھیں دیکھو کہ ان میں روشنی کی کچھ لکیریں ہیں

(''عذابِ ہمسائیگی''، ۱۵۶۔۱۵۸)

فضا اعظمی کی طویل نظم '' آوازِ شکستگی'' (صدا آتی ہے تہذیبوں کے مدفن سے) ڈھائی ہزار سے زائد مصرعوں پر محیط آزاد نظم ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں موجودہ دور کے سب سے اہم موضوع یعنی تہذیبوں کے تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت اور نیو ورلڈ آرڈر کی تشکیل کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور کے طور پر سامنے آیا اور اس نے مسلم دنیا کو ایک جارح قوت کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ نائن الیون کے ڈرامے کے بعد اس تصادم میں بے حد شدت آ گئی اور عراق، شام، یمن، مصر، لیبیا، سوڈان، افغانستان اور پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک اس تہذیبی تصادم کی بناء پر زوال و ادبار کی صورتِ حال سے دوچار ہیں باہمی تصادم کی اس صورتِ حال نے پوری دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کے دہانے پر پہنچا دیا ہے اور عیسائیت، یہودیت اور ہندومت جیسے بڑے مذاہب کو اسلام کے مقابلے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے یہ نظم اسی صورتِ حال کو دردمندی سے منعکس کرتی ہے اور ساری دنیا کے مسلم عوام کی آواز اور متوازن سوچ رکھنے والے مسلمانوں کے دل کی پکار ہے نظم کا اختتام بین المذاہب اخوت و مساوات کا درس بھول جانے والوں اور تصادم کا آتش فشاں بھڑکانے والوں کو دیے گئے اس پیغام سے ہوتا ہے کہ سزا اور جزا کا وقت بہت قریب ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کے مطابق اس نظم میں 'ہنٹنگٹن' ایسے مفکرین کے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک بڑے تناظر میں آج کی تہذیبی جنگ کا جائزہ لیا گیا ہے اور یوں ایک اور تہذیبی آویزش کا منظر نامہ سامنے آ گیا ہے (۱۹)۔

بہر حال غزلوں، مختصر نظموں اور دیگر اصنافِ سخن سے قطع نظر طویل نظم بطور خاص سیاسی فکر سے متاثر رہی ہے۔ اقبال نے جمہوریت، ملوکیت، اور سرمایہ داری کا پردہ جس طرح طویل نظموں میں چاک کیا وہ ترقی پسند تحریک تک آتے آتے اور آگے بڑھا کیونکہ زوال پذیر مغل تہذیب کے بعد فرنگی سامراج کے جبریہ تسلّط کے دور سے اُردو کے تخلیق کار براہ راست متاثر ہوئے۔ اشتراکی انقلاب، مارکسی فکر اور پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے اثرات کی بناء پر تاریخی شعور اور سیاسی بیداری کے عمل میں توسیع ہوئی اسی لیے عزیز حامد مدنی کہتے ہیں۔

> '' وہ سارے سوالات جو معاشرے میں اٹھتے ہیں ان کا پہلا جواب سیاست و معاشیات کے شعبوں میں ہوتا ہے اور وہی فکر کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ یہ فکر سیاسی و معاشی انسان کی عافیت، سکون کے لیے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے لیے جن سانچوں میں ڈھلتی ہوئی ادب تک پہنچی ہے وہ ہر زبان کے تخلیقی کارناموں سے عیاں

ہے اور ہمارے ادب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں یہ دیکھیے کہ اس دور کی
شاعری میں لفظیات، فکر کا رخ، سماجی ادراک کس طرح کا ہے۔ کتنے لب و لہجے
ہیں، کیا تازگی ہے جو زبان کے نئے زاویے بناتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے۔(۲۰)''

تحریکِ پاکستان کی ہنگامہ خیزی، نئے علوم کی آگہی، قیامِ پاکستان سے اب تک وطنِ عزیز کے سیاسی نشیب و فراز، معاشی و معاشرتی پسماندگی، ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ، مذہبی انتہا پسندی اور تہذیبوں کے تصادم نے طویل نظم کے تخلیق کاروں کو فکر و احساس کی سطح پر جس طرح متاثر کیا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اگرچہ سیاسی فکر کی روایت میں جدید اُردو شاعری کی صرف چند ہی طویل نظموں کا جائزہ زیرِ نظر مقالے میں ممکن ہو سکا ہے لیکن یقیناً ایسی اور بھی طویل نظمیں ہوں گی جو ہماری توجہ کی طالب ہیں کیونکہ طویل نظم تاریخی، تہذیبی و سماجی عناصر کی بازیافت، خارجی ادراک، عصری شعور، فلسفیانہ بصیرت اور حکیمانہ نظر کی صفات سے متصف ہوتی ہے۔

حواشی:

(۱) عزیز حامد مدنی، جدید اُردو شاعری، حصّہ اوّل، (کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص ۸۰۔
(۲) ایضاً، ص ۸۱۔
(۳) نعیم احمد، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ (علی گڑھ: ادبی اکادمی، ۱۹۷۹ء)، ص ۳۶۔
(۴) رشید امجد، اُردو شاعری کی سیاسی اور فکری روایت، مشمولہ نقوش، (شمارہ نمبر ۱۴۱)، ص ۷۵۔
(۵) آل احمد سرور، خضرِ راہ ایک مطالعہ، مشمولہ اقبال کا فن، مرتب: گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۷ [بار دوم]۔
(۶) ایضاً، ص ۳۷۔
(۷) احمد ہمدانی، خضرِ راہ، مشمولہ سہ ماہی سیپ کراچی، (شمارہ نمبر ۶۰)، ص ۱۹۸۔
(۸) مجتبیٰ حسین، جوشِ اعظم، مشمولہ افکار کراچی، جوش نمبر (کراچی: مکتبۂ افکار، ۱۹۶۲ء)، ص ۵۳۲ [بار دوم]۔
(۹) احمد ہمدانی، نئی دنیا کو سلام: ہیئت کا ایک نیا تجربہ، مشمولہ افکار، علی سردار جعفری نمبر (کراچی:، دسمبر ۱۹۹۱ء)، ص ۴۸۶۔
(۱۰) تحسین فراقی، ضیاء الحسن ڈاکٹر (مرتبین)، کس دھنک سے مرے رنگ آئے (لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۰ء)، ص ۹۸۔۹۹
(۱۱) ایضاً، ص ۱۳۶۔
(۱۲) ابنِ انشاء، چاند نگر (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۲ [طبع چہارم]۔
(۱۳) ریاض احمد ریاض، ابنِ انشاء احوال و آثار (کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۵۔
(۱۴) ساحر لدھیانوی، پرچھائیاں (لاہور اکیڈمی، ۱۹۵۹ء)، ص ۹ [دوسرا ایڈیشن]۔

(۱۵) اختر الایمان، کلیاتِ اختر الایمان (کراچی: ایجوکیشنل پبلشرز، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۰۲۔
(۱۶) حمایت علی شاعر، کلیاتِ شاعر (کراچی: دنیائے ادب، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۱۸۔
(۱۷) سلیم احمد، کلیاتِ سلیم احمد (اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۶۵۔
(۱۸) ستیہ پال آنند، انسان: ایک میگا مہابیانیہ، مشمولہ قومی زبان، عالی نمبر (کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، مئی ۲۰۱۶ء)، ص ۲۸۹۔
(۱۹) عقیل احمد فضا اعظمی، آوازِ شکستگی (کراچی: اوکھائی پریس، ۲۰۰۴ء)، فلیپ۔
(۲۰) عزیز حامد مدنی، محولہ بالا، ص ۱۴۳

مآخذ:

آنند، ستیہ پال، انسان: ایک میگا مہابیانیہ، مشمولہ قومی زبان، عالی نمبر، کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، مئی ۲۰۱۶ء۔
ابنِ انشاء، چاند نگر، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۸ء، [طبع چہارم]۔
احمد، نعیم، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، علی گڑھ: ادبی اکادمی، ۱۹۷۹ء۔
احمد، سلیم، کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۳ء۔
اختر الایمان، کلیاتِ اختر الایمان، کراچی: ایجوکیشنل پبلشرز، ۲۰۰۰ء۔
امجد، رشید، اُردو شاعری کی سیاسی اور فکری روایت، مشمولہ نقوش، شمارہ نمبر ۱۴۱، ص ۷۵۔
حسین، مجتبیٰ، جوشِ اعظم، مشمولہ افکار کراچی، جوش نمبر، کراچی: مکتبۂ افکار، ۱۹۶۲ء، [بار دوم]۔
ریاض، ریاض احمد، ابنِ انشاء احوال و آثار، کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۸۵ء۔
ساحر لدھیانوی، پرچھائیاں، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۵۹ء، [دوسرا ایڈیشن]۔
سرور، آل احمد، خضرِ راہ ایک مطالعہ، مشمولہ اقبال کا فن، مرتب: گوپی چند نارنگ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء، [بار دوم]۔
شاعر، حمایت علی، کلیاتِ شاعر، کراچی: دنیائے ادب، ۲۰۰۸ء۔
فراقی، تحسین، ضیاء الحسن (مرتبین)، کس دھنک سے مرے رنگ آئے، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۰ء۔
فضا اعظمی، عقیل احمد، آوازِ شکستگی، کراچی: اوکھائی پریس، ۲۰۰۴ء۔
مدنی، عزیز حامد، جدید اُردو شاعری، کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، ۱۹۹۰ء، [حصہ اوّل]۔
ہمدانی، احمد، خضرِ راہ، مشمولہ سہ ماہی سیپ کراچی، شمارہ نمبر ۶۰۔
_____، نئی دنیا کو سلام: ہیئت کا ایک نیا تجربہ، مشمولہ افکار، علی سردار جعفری نمبر، کراچی: افکار فاؤنڈیشن، دسمبر ۱۹۹۱ء۔